www.shibliinternational.com

اپریل April 2020

ISSN: 2581-9216

ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد

Urdu Monthly **SADA E SHIBLI** Hyderabad

ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد حامد ہلال اعظمی

-/20 روپے

Issue26 شمارہ_Vol:3 جلد:

اپریل April :2020

ماہنامہ

حیدرآباد

صدائے شبلی

مدیر: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران: ڈاکٹر سراج احمد انصاری ☆ ڈاکٹر عبدالقدوس ☆ ابوہریرہ یوسفی

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، استاذ الاساتذہ حضرت رحمٰن جامی

پروفیسر مظفر علی شہہ میری، پروفیسر محسن عثمانی ندوی

پروفیسر ابوالکلام پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی،

ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، مولانا ارشاد الحق مدنی،

مولانا محمد مساعد ہلال احیائی، اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ

محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق، ڈاکٹر حمران احمد، ڈاکٹر جاوید کمال

ڈاکٹر ناظم علی، ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر غوثیہ بانو

ڈاکٹر سمیہ تمکین، ڈاکٹر سید امام حبیب قادری، ڈاکٹر

فاروق احمد بھٹ، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، مولانا احمد نورعینی

ڈاکٹر مصلح الدین نظامی، ابوہریرہ ایوبی، محسن خان

SADA E SHIBLI
A/c: 1327102000023922
IFSC CODE: IBKL0001327
IDBI BANK, CHARMINAR HYD, TS

قیمت فی شمارہ: 20

سالانہ: 220 - بیرونی ممالک: 50/امریکی ڈالر

خصوصی تعاون: 1000

ماہنامہ "صدائے شبلی" حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ

9392533661 | 8317692718

Email: sadaeshibli@gmail.com

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352, B1, 2nd Floor,Bafana Complex,
Near Asfya Masjid Dabirpura Road, Purani Haveli,Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اپنی بات	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	۵
۲	اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	علامہ شبلی نعمانیؒ	۶
۳	عہد جدید کا ایک تبدیلی ساز مفکر سید جمال الدین افغانی.....	پروفیسر انور معظم	۷
۴	غزل	ظہور ظہیر آبادی	۱۰
۵	دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ (قسط:۲۳)	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	۱۱
۶	ایمان بالآخرت	مولانا صدرالدین اصلاحی	۱۵
۷	پانی، مذہب اسلام اور صحت	مولانا انصار احمد معروفی	۱۷
۸	علامہ سید سلیمان ندوی کا تاریخی شعور	محمد تنظیم عالم	۲۲
۹	قمر جمالی کے افسانے 'جنگ' کا تنقیدی تجزیہ	ڈاکٹر محمد نہال افروز	۲۷
۱۰	سلطنتِ آصف جاہی کی فارسی خدمات: ایک مختصر جائزہ	سید حسین مہدی	۳۰
۱۱	اردو میں نعت گوئی کا آغاز وارتقاء	گلزار احمد ماگرے	۳۵
۱۲	زباں بریدہ	مبصر: ڈاکٹر ابرار احمد	۴۰

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

ابو سفیان اعظمی، مقیم حال ممبئی.....الحاج **محمد منیرالدین عرف ولی**، آغا پورہ حیدرآباد

ڈاکٹر سید **جلیل حسین** ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد.....الحاج **محمد عبد الستار** سیکھ ویلج سکندرآباد حیدرآباد

علی میاں احمد پٹھان رائے گڑھ (مہاراشٹر).....**علی احمد عبد اللہ** کونچالی، رائے گڑھ (مہاراشٹر)

الحاج **رئیس احمد اقبال** انجینئر، سیکھ ویلج سکندرآباد حیدرآباد.....**محمد عبدالماجد** ایڈوکیٹ، سکندرآباد، حیدرآباد

جناب قاضی **فیض الدین**، اپر توڑیل، مہاڈ، رائے گڑھ مہاراشٹرا۔ ڈاکٹر **شہباز احمد**، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج چارمینار، حیدرآباد.....مولانا **محمد عبدالقادر سعود** نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد۔

الحاج **محمد قمرالدین** نبیل کالونی بارکس حیدرآباد

اپنی بات

جب یہ شمارہ آپ کے دسترس میں ہوگا، تو اس وقت رمضان المبارک کا مقدس مہینہ رواں ہوگا، ماہ مقدس کا پہلا عشرہ رحمت، دوسرا مغفرت اور تیسرا نجات عن النار کا ہے۔ روزہ کا اجر اللہ کی طرف سے ہے، روزہ ڈھال ہے، جس سے انسان کے قلب کی حفاظت ہوتی ہے۔ اس ماہ میں نفل کا ثواب فرض اور فرض کا ثواب ستر فرض کے برابر ہوجاتا ہے۔ اسی ماہ میں شب قدر ہے، جس میں عبادت کا ثواب ہزار گنا بڑھ جاتا ہے، اسی شب میں قرآن مجید نازل ہوا، جو ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ ادارہ اپنے قارئین سے مودبانہ گزارش کرتا ہے کہ اس ماہِ مقدس کے دو اوقات میں یعنی افطار اور سحری میں دعاؤں کا خاص اہتمام فرمائیں ،تاکہ پورے عالم سے اس نادیدہ دشمن کرونا کا خاتمہ ہوجائے، ہمارے ملک کے وزیر اعظم نے بھی گھنٹی، تھالی، موم بتی ،ٹارچ، کے بعد ملک کے مسلمانوں سے دعا کی اپیل کی ہے کہ رمضان المبارک میں ایسی دعا کریں کہ کرونا ختم ہوجائے، اے ارحم الراحمین ہماری دعاؤں کو قبول فرما۔ آمین یارب العالمین۔

رمضان المبارک میں اکثر مسلمان زکوۃ نکالتے ہیں، عام طور پر رشتہ داروں کے بعد زکوۃ کی رقم مدارس اسلامیہ کو دی جاتی ہے، کیونکہ مدارس میں ان طلبا وطالبات کی اکثریت ہوتی ہے، جن کے ماں باپ یا سرپرست معاشی طور پر کمزور ہوتے ہیں، مدارس میں ان کی تعلیم وتربیت پر خاص توجہ دی جاتی ہے، جس کی وجہ سے ہمارے معاشرے کو صالحیت کی طرف گامزن کرنے کے لیے حافظ، قاری، عالم، فاضل، کامل، مفتی، امام وموذن کی شکل میں ملت کی بے لوث خدمت کرنے والے افراد مل جاتے ہیں، اس وجہ سے ادارہ تمام مسلمانوں سے ادبا گزارش کرتا ہے کی وہ اپنی زکوۃ، صدقات وعطیات کی رقم موجودہ حالات کے مدنظر مدارس اسلامیہ کو ضرور عطا کریں، انشا اللہ سعادت دارین نصیب ہوگی۔

کووڈ۔۱۹ نے پوری دنیا کے ہر شعبہ حیات کو بے بس کردیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسان کے علاوہ دنیا کی ہر مخلوق اس نادیدہ دشمن کرونا سے محفوظ ہے، آخر انسان نے وہ کون سا کام کردیا ہے کہ اگر گھر سے باہر نکلتا ہے تو منھ چھپا کر نکلتا ہے اور اپنے ہی گھر میں گھر کا بندی بنا ہوا ہے۔ یہ انسان کا ظلم ہے یا گناہ؟۔

اس وبا سے ابھرنے کے لیے حکومت تمام وسائل اختیار کرنے کے بعد بھی اکثر جگہ ناکام نظر آتی ہے اسی بنا پر ملک کے بیشتر افراد کی پیشانی سے پریشانی کا اظہار ہورہا ہے۔ چھوٹے بڑے کاروبار بند ہیں، ملازم اور مجبور طبقہ مایوسی کا شکار ہورہا ہے ،کیونکہ خاطر خواہ اسے ریلیف نہیں مل رہی ہے، کچھ لوگ آج بھی سماج میں ہیں کہ جن سے انسانیت کا بھرم قائم ہے، اور وہ لوگ اپنے تن من دھن سے بلکہ قرض اور اپنی جائدادوں کو فروخت کرکے مجبور اور بے بس لوگوں کی مدد کررہے ہیں، اللہ ان کی بے لوث خدمات کو قبول فرمائے۔ آمین اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جن کا دل پتھر ہے بلکہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہے جو مجبوروں، معذوروں اور غریبوں سے اپنے ذاتی مفاد کو ریاکاری کرتے ہوئے پورا کررہے ہیں۔ اللہ ایسے لوگوں کے اعمال کو اکارت کردیتے ہیں۔

محمد محامد ہلال اعظمی

اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانیؒ

حسن معاملہ:

معمول تھا کہ کوئی جنازہ لایا جاتا تو پہلے فرماتے کہ میت پر کچھ قرض تو نہیں ہے، اگر معلوم ہوتا کہ مقروض تھا، تو صحابہؓ سے فرماتے کہ جنازہ کی نماز پڑھادو، خود شریک نہ ہوتے۔

ایک دفعہ کسی سے اونٹ قرض لیا، جب واپس کیا تو اس سے بہتر اونٹ واپس کیا اور فرمایا، سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو قرض کو خوش معاملگی سے ادا کرتے ہیں۔

ایک دفعہ کسی شخص سے ایک پیالہ مستعار لیا، سوئے اتفاق سے وہ گم ہوگیا، تو اس کا تاوان ادا فرمایا

عموماً فرمایا کرتے تھے کہ میں تین دن سے زیادہ اپنے پاس ایک دینار بھی رکھنا پسند نہیں کرتا، بجز اس دینار کے جس کو قرض ادا کرنے کے انتظار میں اپنے پاس رکھ چھوڑتا ہوں۔

ایک دفعہ ایک بدو اونٹ کا گوشت بیچ رہا تھا، آنحضرت ﷺ کو یہ خیال تھا کہ گھر میں چھوہارے موجود ہیں، آپؐ نے ایک وسق چھوہاروں پر گوشت چکالیا، گھر میں آکر دیکھا تو چھوہارے نہ تھے، باہر تشریف لاکر قصاب سے فرمایا کہ میں نے چھوہاروں پر گوشت چکالیا تھا لیکن چھوہارے میرے پاس نہیں ہیں، اس نے واویلا مچائی کہ ہائے بددیانتی! لوگوں نے سمجھایا کہ رسول اللہ بددیانتی کریں گے؟ آپ نے فرمایا نہیں چھوڑ دو، اس کو کہنے کا حق ہے، پھر قصاب کی طرف خطاب کرکے وہی فقرہ ادا کیا، اس نے پھر وہی لفظ کہے، لوگوں نے پھر روکا، آپؐ نے فرمایا، اس کو کہنے دو، اس کو کہنے کا حق ہے اور اس جملہ کو کئی بار دہراتے رہے، اس کے بعد آپؐ نے ایک انصاریہ کے ہاں اس کو بھیجوایا کہ اپنے دام کے چھوہارے وہاں سے لے لے جب وہ چھوہارے لے کر پلٹا تو آپؐ صحابہؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے، اس کا دل آپؐ کے حلم وعفو اور حسن معاملت سے متاثر تھا، دیکھنے کے ساتھ بولا محمد ﷺ! تم کو خدا جزائے خیر دے، تم نے قیمت پوری پوری دی اور اچھی دی۔

ایک دفعہ مدینہ منورہ کے باہر ایک مختصر سا قافلہ آکر فروکش ہوا، ایک سرخ رنگ کا اونٹ اس کے ساتھ تھا، اتفاقاً ادھر سے آپؐ کا گذر ہوا، آپؐ نے اونٹ کی قیمت پوچھی، لوگوں نے قیمت بتائی، بے مول تو کیے آنحضرت ﷺ نے وہی قیمت منظور کرلی، اونٹ کی مہار پکڑ کر شہر کی طرف روانہ ہوگئے، بعد لوگوں کو خیال آیا کہ بے جان پہچان ہم نے جانور کیوں حوالہ کردیا اور اس حماقت پر اب قافلہ کو ندامت تھی، قافلہ کے ساتھ ایک خاتون بھی تھی، اس نے کہا "مطمئن رہو، ہم نے کسی شخص کا چہرہ ایسا روشن نہیں دیکھا، یعنی ایسا شخص دغا نہ کرے گا، رات ہوئی تو آپؐ نے ان کے لیے کھانا اور قیمت بھر کھجور بھجوادی۔

غزوۂ حنین میں وآپ کو کچھ اسلحہ کی ضرورت تھی، صفوان اس وقت تک کافر تھے، ان کے پاس بہت سی زرہیں تھیں، آپؐ نے ان سے کچھ زرہیں طلب کیں، انہوں نے کہا محمد ﷺ! کیا کچھ غصب کا ارادہ ہے؟ فرمایا نہیں، میں عاریتاً مانگتا ہوں، اگر ان میں سے کوئی تلف ہوئی تو میں تاوان دوں گا، چنانچہ انہوں نے چالیس زرہیں مسلمانوں کو عاریتاً دیں، حنین سے واپسی کے بعد جب اسلحہ اور دیگر سامانوں کا جائزہ لیا گیا، تو کچھ زرہیں کم نکلیں، آپؐ نے صفوان سے کہا، تمہاری چند زرہیں کم ہیں، ان کا معاوضہ لے لو، صفوان نے عرض کیا "یارسول اللہ ﷺ میرے دل کی حالت اب پہلے جیسی نہیں" یعنی مسلمان ہوگیا، اب معاوضہ کی حاجت نہیں)۔

پروفیسر انور معظم۔ حیدرآباد

عہدِ جدید کا ایک تبدیلی ساز مفکر سید جمال الدین افغانی
ایک تعارف

یہی فلسفے کی تعلیم کا فقدان ہے جو افغانی کی نظر میں اسلامی ممالک کے تعلیمی نظام کے غیر مؤثر ہونے کا سب سے بڑا ہے۔ وہ اس وقت (وسط انسویں صدی) کے اسلامی تعلیمی نظام پر تنقید کرتے ہیں کہ:

''دولت عثمانیہ اور دولت خدیویہ مصر نے سات سال ہوئے علوم جدیدہ کی تعلیم کے لیے مدرسے کھول رکھے ہیں لیکن اب تک ان علوم سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ وجہ یہ ہے کہ ان مدرسوں میں علوم فسلفہ کی تعلیم نہیں ہوتی اور فلسفے کی روح نہ ہونے سے ان علوم جدیدہ سے، جنہیں انسانی اعصاء کی طرح ہم آہنگی کے استھ کام کرنا چاہیے تھا، کوئی معتد بہ فائدہ نہیں ہوا۔ بلاشبہ اگر ان مدارس میں روح فلسفہ موجود ہوتی تو وہ اس سات سال کے عرصہ میں بلاد یورپ سے مستغنی ہوجاتے۔ علم کے بل پر اپنے ممالک کی اصلاح کرلیتے، ہر سال اپنی اولاد کو یورپی ممالک نہ بھیجتے اور اپنے مدارس کے لیے وہاں سے استاد طلب نہ کرتے''۔

تجدیدیت کے علم بردار کی حیثیت سے افغانی نے سب سے پہلے مسلمانوں کے نظام تعلیم کی اصلاح کی طرف توجہ کی اور اس کی بنیادی کمزوری کو پہچانا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے افغانی کی مراد یہ تھی کہ عالم اسلام میں جدید علوم کی طرف توجہ کے لیے باقاعدہ تحریک چلائی جائے اور منظم طور پر اس کا کام آگے بڑھایا جائے۔ مغربی ملکوں کا محض محتاج بن کر رہے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ حصول علم کے لیے بھی ہر ملک کو خود مکتفی ہونے کی ضرورت ہے۔ مغربی تعلیم کا حصول بذات خود کوئی نقصان رساں بات نہیں لیکن ایسا کرتے ہوئے اپنے قومی وقار کا پورا تحفظ ضروری ہے۔ بصورت دیگر اس کا امکان ہے کہ ایسے تعلیم یافتہ افراد قوم کے لیے تباہی کا ذریعہ ثابت ہوں۔

''قومی کے وہ لوگ جو دوسرے کے عادات و خصائل کو اپنا کر اندھا دھند ان کی تقلید کرتے ہیں، دشمنوں کے لیے قوم کی عمارت میں روشن دانوں اور کھڑکیوں کا کام کرتے ہیں جن کے ذریعے دشمنوں کو داخل ہونے کا راستہ ملتا ہے''۔

آگے چل کر افغانی اس نکتے کو مزید واضح کرتے ہیں۔

''ایسی اندھی تقلید کرنے والے لوگ مخالفوں کی سپاہ کے لیے مقدمۃ الجیش یا پانچویں کالم کا کام سرانجام دیتے ہیں، لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کے لیے راستہ ہموار کرتے ہیں اور پھر ان کے آلہ کار بن کر ان کے قدم مضبوط اور ان کے تسلط اور اقتدار کی بنیادیں مستحکم کرتے ہیں صرف اس لیے کہ ان کے نزدیک یہی لوگ علم اور ہنر کے تنہا مالک اور طاقت و قوت کا ناقابل تسخیر مرتبہ رکھنے والے ہیں''۔

(افغانی کے یہ خیالات آج کس قدر صداقت رکھتے

ہیں)

افغانی کی سرسید پر تنقید:

اسی تعلیمی نقطہ نظر کے سلسلے میں افغانی سرسید سے متصادم ہوتے ہیں۔ سرسید کا سب سے بے رحم نقاد افغانی ہی کو کہا جاسکتا ہے، لیکن اس طرز عمل کو ہم بے جا بھی نہیں ٹھہرا سکتے۔ افغانی بنیادی طور پر سرسید کی ''مفاہمت'' کی پالیسی کو ناپسند کرتے تھے اور اسے مسلمان قوم کے وقار کے منافی خیال کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ایم۔اے۔او کالج کی بھی سخت مخالفت کی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس تعلیمی ادارے کا مقصد انگریزی کے آلہ کار افراد ڈھالنا ہے۔ افغانی کی سرسید پر تنقید کو ممکن ہے قدامت پسند ملاؤں کے عام طرز عمل کے مطابق بتلایا جائے لیکن یہ درست نہیں۔ سطور بالا میں مغربی تعلیم کے لیے ان کی تائید ثابت کیگئی ہے اور ہندوستان میں وہ انگریزی تعلیم کو بذات خود برا نہیں سمجھتے تھے بلکہ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں انگریزی کے ذریعے علوم جدیدہ سیکھنے پر بہت زور دیا ہے۔ دراصل افغانی پورے عالم اسلام کو مغربی تسلط سے آزاد کرنا چاہتے تھے۔ ان کے لیے انگریزوں سے (جو ان کے خیال میں مسلمان ممالک کے سخت دشمن تھے) مفاہمت کا تصور ہی محال تھا۔

مسلمانوں کے سماجی اور مذہبی تنزل کے اسباب:

افغانی نے مسلمانوں کے سیاسی و مذہبی تنزل کے دو اسباب تلاش کیے۔ پہلا خارجی نوعیت رکھتا ہے یعنی مغربی ممالک کی استحصالی کارروائیاں۔ دوسرا داخلی یعنی مسلمانوں کا اسلامی اصولوں سے انحراف۔ ان اسباب کی مناسبت سے وہ مسلمانوں کے احیا کو بھی دو محاذوں پر منقسم کرتے ہیں۔ سیاسی اور اصلاحی یا خارجی اور داخلی۔ سیاسی غلامی سے آزاد ہونے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان فوجی اعتبار سے طاقتور ہو جائیں۔ یہ مقصد حل کرنے کے لیے مغربی فن جنگ کا سیکھنا اور جدید عصری آلات حرب کا حصول ناگزیر ہے۔ داخلی طور پر مسلمانوں کی اخلاقی، تعلیمی اور مذہبی اصلاح کے لیے ایک منظم تحریک کے تحت کام شروع ہونا چاہیے۔ اس میں ترجیح جدید علوم کے حصول کو ملتی ہے۔ جب تک سائنسی تعلیم سے مسلمان آراستہ نہیں ہوتے، مسلمانوں کی ترقی ممکن نظر نہیں آتی۔ مسلمان حکومتوں کی کمزوری کے اسباب افغانی کے نزدیک یہ ہیں کہ اولاً مسلمان سلاطین اپنی خودغرضی میں ایک دوسرے کی مخالفت اختیار کیے ہوئے ہیں، ہر مسلمان حکومت کا بااقتدار طبقہ انفرادی جاہ و منصب کے حصول میں قومی مفاد کو نظر انداز کیے جارہا ہے۔ دوم علماء نے عصری ضروریات کو دین کے مطابق پورا کرنے کا فرض بھلا دیا ہے۔

وحدت اسلامیہ:

اسی پہلے سبب کی مطابقت میں افغانی نے اتحاد اسلامی کے نعرے سے عالم اسلام کو روشناس کرایا۔ وہ اسلامی حکومتوں کی پستی کے اسباب پر غور کر کے اسی نتیجے پر پہنچے تھے کہ جب تک تمام اسلامی حکومتیں کسی ایک اتحادی زنجیر میں ایک دوسرے سے بندھ نہیں جاتیں، ان کی ترقی غیر ممکن ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ افغانی سلطان عبدالحمید کے آلہ کار بن کر انہیں عالم اسلام کا خلیفہ یا بالفاظ دیگر بادشاہ بنا دینا چاہتے تھے۔ زیادہ صحیح طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک Confederation کے حامی تھے جس میں قرآنی احکام کا چلن ہو۔

> ''ان باتوں سے میرا یہ مقصد نہیں کہ ان تمام ممالک میں کسی شخص واحد کی حکمرانی تسلیم کی جائے کیونکہ ممکن ہے یہ امر مشکل نظر آئے، لیکن میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ ان سب پر قرآن کا حکم غالب رہے اور سب مذہب اسلام کو اپنے اتحاد و اتفاق کا ذریعہ بنالیں''۔

یہ اتحاد خاص سیاسی اقتدار کا مظہر ہی نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ ساتھ متوازی طور پر علمائے عالم اسلام بھی ایک مرکزی

تنظیم کی شکل اختیار کرلیں۔ افغانی کے نزدیک علم اور سیاست کا اتحاد قومی ترقی کے لیے ازحد ضروری ہے۔ ملتا سلامیہ کے زوال کا آغاز اسی وقت سے شروع ہوگیا جبکہ ''خلافت کے رتبے سے علم کا رتبہ جدا ہوگیا'' چنانچہ علماء کے اتحاد کے بارے میں وہ یہ تجویز پیش کرتے ہیں:

''کرۂ ارض کے مختلف مقامات کے علماء اور امام ایک دوسرے سے ربط پیدا کریں، اپنے اپنے ملک میں اپنی تنظیم اور اتحاد کے مراکز قائم کریں جہاں اپنے اجتماعی اور اتحاد سے متعلق مسائل و حالات پر سوچ بچار کرنے کے لیے جمع ہوسکیں۔ قرآن اور سنت کے بتائے ہوئے مقام کی طرف عوام کی رہنمائی کریں۔ ان مختلف تعلیمات کو پھر ایک ادارہ سے وابستہ کریں جس کا مرکز بیت اللہ شریف ہو''۔

علماء:

اس تجویز کے قابل عمل ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور پھر جن علماء کے اتحاد پر افغانی زور دے رہے ہیں، وہ روایتی قدامت پسند علماء نہیں، بلکہ ان کے لیے شرط ہے کہ وہ علوم اسلامیہ کے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ سے بھی کما حقہ واقفیت رکھتے ہوں۔ روایتی علماء پر افغانی نے شدید حملے کیے ہیں۔ جدید علوم کے متعلق علماء کے منفی رجحان کی مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''علماء نے علم کی دو قسمیں کر رکھی ہیں۔ مسلمانوں کا علم اور فرنگیوں کا علم۔ حالانکہ انسانوں کو علم سے نسبت دینی چاہیے نہ کہ علم کو انسانوں سے۔ وہ اسی جگہ دلائل پیش کریں گے جہاں علوم و معارف کے سیکھنے سے منع کرتا ہوتا ہے اور بزعم خود اس کو اسلامی دین داری اور حفاظت دین سے تعبیر کرتے ہیں۔ درحقیقت وہ تو اسلامی دین داری کے دشمن ہیں''۔

یا علماء کی بے علمی کو یوں نمایاں کرتے ہیں:

''عجیب بات تو یہ ہے کہ ہمارے علماء 'صدری' اور 'شمس البازغہ' پڑھتے ہیں اور فخر سے خود کو حکیم نام دے لیتے ہیں اور اس کے باوجود اپنے دائیں اور بائیں ہاتھ کا فرق نہیں جانتے اور کبھی یہ نہیں غور کرتے کہ ہم کون ہیں، کیا ہیں۔ بے تار برقی سمندری جہاز اور ریلوں کے بارے میں علم حاصل نہیں کرتے۔ عجیب تر بات یہ ہیکہ شام سے صبح تک لالٹین جلائے 'شمس البازغہ' کا مطالعہ فرماتے ہیں اور کبھی اس نکتے پر توجہ نہیں جاتی کہ اگر لالٹین کا فانوس ہٹا دیا جائے تو وہ دھواں کیوں دینے لگتا ہے اور فانوس اپنی جگہ رکھنے پر دھواں غائب کیوں ہوجاتا ہے''۔

افغانی اسلام کو جدید علوم کے حصول میں رکاوٹ نہیں بلکہ اس کا مرتبہ گردانتے ہیں:

''قواعد طبیعہ، دلائل ہندسیہ اور براہین فلسفہ یہ سب کے سب بدیہات ہیں۔ اس لیے اگر کوئی یہ کہے کہ میرا دین بدیہات کے منفی ہے تو گویا خود اس نے اپنے دین کا بطلان کردیا''۔

جہاں تک افغانی کی زندگی میں ان کے مشن کی کامیابی کا تعلق ہے افغانی کی آرزو پوری نہ ہوسکی، لیکن وہی کامیابی ان کی موت کے بعد ظہور پذیر ہونے لگی۔ ایران، ترکی، مصر اور دوسرے عرب ملکوں میں داخلی قومی تحریکوں، عرب قومیت، اتحاد اسلامی وغیرہ کے نعرے، سب کا رشتہ افغانی ہی کے مشن سے جا ملتا ہے۔ نہ صرف اسلامی قومیت کا احساس دلانے میں انہوں نے قومیت کا احساس دلانے میں انہوں نے پیش قدمی کی تھی بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جمال الدین افغانی پہلی

ہستی تھی جس نے مغرب کے مقابلے میں ایشیا کی وحدت، ایشیائی وقار اور مشرق کے وجود پر اصرار کیا۔ سلطان عبدالحمید کے قید خانے سے ان کی موت سے چند روز پیشتر کے خط میں انہوں نے پیش گوئی کردی تھی کہ ''سیل تجدد بسرعت بطرف مشرق جاریست''۔ افغانی کے مشنپر ''عروۃ الوثقیٰ'' کے ایک اداریے سے بھی روشنی پڑتی ہے؛

''ہمارا یہ اخبار کبھی کبھی مسلمانوں کا ذکر خصوصیت سے کرتا ہے اور صرف ان کے حقوق کی طرف سے مدافعت کرتا ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اخبار کا مقصد مسلمانوں کے درمیان اور ان وطنی پڑوسیوں کے درمیان اختلاف کا بیج بونا ہے ..... ہمارا مقصد تو مشرق کے عام باشندوں کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً اجنبیوں کی دست درازی سے ڈرانا ہے۔ کبھی کبھی ہم خالص مسلمانوں کو اس لیے مخاطب کرتے ہیں کہ جہاں اجنبیوں نے خیانت شروع کی ہے اور وہاں کے باشندوں کو ذلیل کیا ہے، وہاں کے محاصل پر قبضہ کیا ہے، وہاں کے اکثر باشندے مسلمان ہیں''۔

اہل مشرق کی مغرب میں پہلی نمائندگی کرنے والے کو اس وقت کیا خبر تھی کہ موت کے بعد نصف صدی کے اندر اندر ہی اسلامی فکر انہی خطوط پر مشرق وسطیٰ میں بیدار ہونے لگے گی جس کی نشان دہی وہ اپنی زندگی میں کر چکا تھا۔

تفصیلی تحقیقاتی مطالعے کے لیے دیکھیے:

Jamal al-Din al-Afghani: A Muslim Intellectual of the East, Insitute of Objective Studies, New Delhi, 2017

ظہور ظہیر آبادی۔ حیدرآباد

غزل

رکھیں سب فاصلہ آپس میں یہ سب کو بتانا ہے
کہ خود بچنا ہے اور سب کو، کورونا سے بچانا ہے

وَبا بھیجی ہے کچھ ایسی کہ حیرت میں زمانہ ہے
ہمارے صبر کو شاید خُدا نے آزمانا ہے

رہیں گھر میں، عبادت بھی کریں اور پھر دعا مانگیں
خُدا ناراض ہے شاید خُدا کو اب منانا ہے

سزا ہے یہ ہمارے ہی غلط اعمال کی لوگو
ہمارے واسطے گھر بھی ہمارا قید خانہ ہے

ہے یہ اللہ کا فرمان بھی قرآن میں واضح
پڑوسی ہے اگر بھوکا اُسے کھانا کھلانا ہے

ضرورت مند کی مل کر مدد کرنا بھی ہے لازم
کہ مل جل کر بُرے اِس وقت کو ہم ہی ہرانا ہے

ظہورؔ اِک یہ بھی فرمانِ نبیؐ ہے گر، وَبا پھیلے
جہاں پر ہیں وہیں رہئے کہیں آنا نہ جانا ہے

قسط:(۲۳) ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ 9838573645

دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ

شبلی کی رومانیت کو سمجھنے کی صحیح کوشش اب تک نہیں کی گئی تھی اور جن لوگوں نے اس پر قلم اٹھایا انھوں نے اسے بمبئی کے دلفریب مناظر میں اسے تلاش کیا ہے یہی وجہ ہے کہ شبلی کے رومان کو صحیح طور پر سمجھا نہیں جاسکا، رشید حسن خاں نے اس کی تشریح اس طرح کی ہے:

''رومانیت شبلی کے مزاج کا بنیادی عنصر تھی، اس سے شگفتگی کے پھول کھلتے ہیں اور مشتعل طبیعت کی آنچ بھی حرارت کو بکھیرتی ہے، اس عالم میں ان کا قلم تحریر کے ایسے پھول کھلاتا ہے جن میں شراروں کی نہیں شعلوں کی گرمی اور چمک ہوتی ہے، یہ کیفیت ان پر اس وقت خاص طور پر طاری ہوتی ہے جب وہ کسی ایسے معترض کے اعتراضات کا جواب دے رہے ہوں جس نے اسلامیات سے متعلق کسی مسئلے پر یا تاریخ اسلام کے کسی دور یا فرد پر نکتہ چینی کی ہو، وہ حوالوں سے اپنی بات کو مستند کرتے جاتے ہیں اور ادبیت میں ڈوبے ہوئے اور ترشے ہوئے جملوں سے جلالی کیفیت کا اظہار کرتے جاتے ہیں، جوش بیان اور حسن انشا پردازی کے لحاظ سے ایسے مقامات لائق ذکر بھی ہیں اور قابل رشک بھی''۔ (ایضاص ۱۱)

پھر خاں صاحب نے اس کی مثالیں درج کی ہیں اور ایسی عمدہ مثالیں دی ہیں کہ ذوق ووجدان کو متاثر کردیتی ہیں۔

بعدازاں انھوں نے شبلی کی عظمت اور ان کی بالغ نظری کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''شبلی کے یہاں اپنے طبقے کی روایت کے بر خلاف وسعت فکر ونظر کی جو طاقت پائی جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عربی کی جدید ترین مطبوعات سے برابر استفادہ کرتے رہتے تھے، وہ کوشش کرتے تھے کہ یورپ کی اہم کتابوں سے بھی کسی واسطے سے استفادہ کیا جائے، ان کو سیاسی مسائل سے بھی لگاؤ تھا، ملک میں سیاسی تحریکیں چل رہی تھیں وہ ان میں بھی کچھ نہ کچھ حصہ لیتے رہتے تھے، انھوں نے اسلامی تاریخ کا بڑی توجہ سے مطالعہ کیا تھا اور فلسفے سے ان کو ربط خاص تھا جس نے ان کے اندر تنگ نظری کو شروع ہی سے پیدا ہونے نہیں دیا''۔ (ایضا ص ۱۲۔۱۳)

رشید حسن خاں شبلی کی عظمت وجامعیت اور بالغ نظر کے تو مداح ہیں ہی ان کے حسن انشاء کے بھی بڑے مداح ہیں، ان کی خوش مذاقی اور شاعرانہ کمالات کا اعتراف بھی بڑے ادبی انداز میں کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''خوش مذاقی اکتسابی چیز نہیں، یہ حصہ جس کو ملا، مل گیا، شبلی کی تحریر میں سخن فہمی، شاعری اور زندگی میں بھی خوش مذاقی ان کی شریک غالب رہی ہے، فارسی کی غزلوں کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ آخر دور اکبری کا

طوطی خوش نوا بول رہا ہے۔ یا نظیری و عرفی کے قبیلے یا جماعت کا کوئی فرد، اسی کا اثر تھا کہ ان کی تحریروں میں بلا کا حسن ہے۔ انشا پردازی جس چیز کا نام ہے وہ واقعۂ شبلی کا حصہ ہے۔ ایسے شگفتہ اور ترشے ہوئے۔ جملے لکھتے ہیں جن میں شاعری کا سارا حسن سمٹ آتا ہے''۔

یہی وہ انداز فکر اور انداز نگارش ہے جس نے شبلی کو ان کے طبقے سے نکال کر اس جماعت کی صف اول میں بیٹھا دیا ہے جہاں کے بیٹھنے والے خوش مذاقی، احساس جمالیات اور حسن سے وہ جہاں بھی ہوں اور جس عالم میں بھی ہوں ربط خاص رکھتے ہیں''۔ (ایضاً ص ۱۳۔۱۴)

پھر خاں صاحب شبلی کی جذباتیت اور رومانیت کو ان کی کمزوری بھی بتاتے ہیں اور یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ کبھی کبھی خوش بیانی میں وہ منطق کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، وہ یہ بھی کہتے ہیں شعر العجم اسی کمزوری کا شکار ہوئی، وہ یہ بھی مثال میں پیش کرتے ہیں کہ ایک جگہ کہتے ہیں کہ بنو امیہ نے آزادی کا گلا گھونٹ دیا مگر جرجی زیدان کی تنقیدوں کا جب جواب دیتے ہیں تو بنو امیہ کی حمایت کرتے ہیں۔ (ص ۱۴)

ان کا یہ بھی خیال ہے کہ وہ دعوی بہت کرتے ہیں، اس کی مثالیں بھی رشید حسن خاں نے دی ہیں، اسی بناء پر وہ شبلی کو محقق سے زیادہ انشا پرداز قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تحقیق خاراشگافی اور کافر طبیعتی کی طلب گار ہے اور زود یقینی اور رنگینی کی دشمن جو شبلی کی طبیعت سے میل نہیں کھاتی، (ص ۱۵) اس لئے ان کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے مذکورہ باتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔

۱۹۸۰ء میں پٹنہ کے ایک سمینار منعقدہ بہار اردو اکیڈمی میں انھوں نے حافظ محمود خاں شبرانی پر مقالہ پیش کیا، عنوان تھا ''شبرانی کی تاریخی اہمیت'' اس میں انھوں نے شبرانی کو تحقیق کا معلم اول قرار دیا ہے۔ (ص ۵۳۲) پھر ان سے پہلے کے عہد سرسید کا تجزیہ پیش کیا ہے، ان کا خیال ہے کہ سرسید تحریک کا اثر تیس برس رہا، اس دور میں سرسید اور ڈپٹی نذیر احمد کی غیر جذباتی نثر کے مقابلہ شبلی و آزاد کی نثر کو زیادہ مقبولیت ملی، انداز فکر میں بھی اور پیرایہ بیان میں بھی، وہ لکھتے ہیں:

> ''شعریت اور جذباتیت کے مارے ذہنوں کو سادگی اور متانت غیر مانوس معلوم ہوتی تھی۔ حالی کی سادہ وصاف نثر ابالی کھچڑی کی طرح بے مزہ لگتی تھی۔ شہرہ تھا شبلی و آزاد کی نثر کا، جس میں ذہنوں کو متاثر کرنے کی ایسی صلاحیت تھی اور ہے کہ آدمی کچھ دیر کے لئے ساری منطق بھول جاتا ہے..... شبلی کا مشتعل اور ذلیبانہ لہجہ اور پرزور جذباتی انداز استدلال ذہنوں کو زیادہ متاثر کرتا ہے۔''
>
> (ایضاً ص ۵۳۳)

رشید حسن خاں کا خیال ہے کہ حالی، شبلی و آزاد کا دور جذباتیت کا دور تھا، یہی وجہ ہے کہ اس دور میں انشاء پردازوں کو محققین کے مقابلے میں زیادہ مقبولیت ملی، شیرانی کی تنقید شعر العجم کے خلاف جو آوازیں بلند ہوئی اس کو وہ اس دور کی فضا کا ردعمل قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے اس مضمون میں یہ بات پھر دہرائی ہے کہ شبلی حالی اور آزاد میں کسی میں وہ مزاج نہیں پایا جاتا جس کو تحقیق کہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''حالی کی سلامت روی، وضع داری اور عفو ودرگذر کی پاکیزہ خصلت تحقیق کی کافر طبیعتی اور بے رحمی کی حریف نہیں ہوسکتی۔ شبلی کی بے کراں اور بے اماں جذباتی طبیعت، ہیرو پرستی اور ان کا خطیبانہ

اورمجاہدانہ انداز بیان، منطقی استدلال تحقیق پسندی سے میل نہیں کھاتا، شبلی عالم تھے۔ بہت ذہین، بڑے سخن فہم اور بہت بڑے انشاء پرداز تھے۔ان کی بے مثال خوبیوں کا انکار مقصود نہیں لیکن وہ بھی حالی کی طرف محقق نہیں تھے۔ان کے مزاج کو تحقیق کے غیر جذباتی عمل سے مناسبت نہیں تھی۔ جذباتیت منطق کی دشمن ہے اور انشاپردازی حقیقت بیانی کی حریف ہے۔'' (ص ۵۳۵)

یہ تجزیہ اور یہ پس منظر دراصل حافظ محمد شیرانی کی تحقیقات کی اہمیت واضح کرنے کے لئے پیش کیا گیا ہے، اس تجزیہ میں کئی باتوں میں خاں صاحب سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، خاں صاحب جب حافظ محمود شیرانی کے مزاج کی تحقیق اوران کے اسلوب کا ذکر کرتے ہیں یا پھران کی تحقیقات کی داد دیتے ہیں تو انھیں یاد آجاتا ہے کہ شیرانی صاحب نے بھی اپنی تحقیقات میں کہیں کہیں انشاپردازی کی ہے، وہ دیانت دار تجزیہ نگار کی طرح اس کمی ک اعتراف کرلیتے ہیں، بلاشبہہ یہ ان کی دیانت دارانہ عظمت ہے مگر انصاف نہیں، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ شیرانی اپنی تحقیق کے اصولوں کا ذکر نہیں کرتے، اس کے باوجود ان کی تحقیقات پر حروف نہیں آتا۔ یہاں یہ بات کہنے کو جی چاہتا ہے کہ شبلی کی محققانہ حیثیت سے غالباً خاں صاحب پوری طرح واقف نہیں تھے مثلاً انھوں نے المامون میں، الفاروق میں، الغزالی میں سوانح مولانا روم میں جس محققانہ انداز کو اختیار کیا ہے اور جو تحقیقات پیش کی ہیں خاص طور پر تحقیق منسوبات میں وہ اپنے عہد کی ممتاز محقق ہیں۔ پھر خاں صاحب ذہن ومزاج کی بات اٹھاتے ہیں۔شبلی نے روایت ودرایت، اصول استنباط نتائج اور حوالہ وغیرہ کا جس طرح اہتمام کیا ہے اور ان تحقیقی اصولوں کی پاسداری کی ہے کم ازکم ان کے عہد میں تو اس کی مثال نہیں ملتی، دراصل خاں صاحب کے پیش نظر محض شعرالعجم کے وہ مباحث تھے جو شیرانی صاحب نے بہ تنقید شعرالعجم میں پیش کئے تھے، بنظر غائر دیکھا جائے تو شبلی کے یہاں تحقیق کے ابتدائی اور بنیادی عناصر موجود ہیں، ہمارے نقادوں کی نظر شعرالعجم اور موازنہ پر جاکر..... جاتی ہے اور المامون، الفاروق اور سوانح مولانا روم کی تحقیقات بلکہ جزبہ کتب خانہ اسکندریہ اور اورنگ زیب عالم گیر ہر ایک نظر کو مذہبی اور تاریخی تحقیقات کہہ کر نظر انداز کردیتے ہیں۔ ان کا یہی صرف نظر انھیں حقیقت سے آشکارا ہونے میں سدراہ رہا۔

رشید حسن خاں نے تنقید شعرالعجم پر روشنی ڈالی ہے لیکن اس کے طرف دار ضرور نظر آتے ہیں، مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''تنقید شعرالعجم کے عنوان سے اکتوبر ۱۹۲۲ء سے جنوری ۱۹۲۷ء تک جو سلسلہ مضامین شائع ہوا، دراصل اس نے ذہنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور علمی دنیا میں شدید ردعمل کا آغاز ہوا۔ ردعمل کی شدت اس پر گواہ تھی کہ عقیدت مندی اور شخصیت پرستی کے جذبے کو ٹھیس لگی ہے۔ روایت درست ذہن نے جس کی اس زمانے میں حکومت تھی یہ محسوس کیا کہ یہ منفی انداز نظر ہے اور حد ادب کی خلاف ورزی ہے۔ جذباتی روایت پرستی نے یہ بات ذہن نشیں نہیں ہونے دی کہ یہ صداقت کی تلاش اور کھرے کھوٹے کی پرکھ ہے۔'' (ص ۵۳۸)

بلاشبہہ صداقت کی تلاش اور کھرے کھوٹے کی پرکھ پر قدغن نہیں لگائی جاسکتی مگر کسی تنقید سے کوئی شخصیت زد میں آئے تو گویا اس پر نقد نہیں کہا جاسکتا، اگر جو نقد کیا گیا ہے وہ

صحیح ہی کیوں نہ ہو، شخصیت پرستی کے ضمن میں آجائے گا جس کی خاں صاحب کے یہاں اجازت نہیں گویا کسی شخص پر اگر کسی نے قلم اٹھایا تو بہرحال خاموش رہنا ہوگا۔ تحقیق وتنقید کے میدان میں یہ اصول ہی کسی طور جائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔ تنقید شعرالعجم کے خلاف بلاشبہہ شدید ردعمل ہوا، وجہ صاف ظاہر ہے کہ شیرانی صاحب نے ایک دو برس نہیں پورے پانچ برس شعرالعجم اور شبلی کو تختہ مشق بنائے رکھا، پھر اسے تنقید کا نام کیوں دیا گیا۔ اسے تصحیحات شعرالعجم کا نام بھی دیا جاسکتا تھا، یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ تنقید شعرالعجم سے پہلے کئی تنقیدیں شائع ہوچکی تھیں مولانا عبدالسلام ندوی نے بھی اس پر تنقید لکھی تھی البتہ ان کا لہجہ انتہائی متانت آمیز ہے اور استاذ کے ساتھ یہی اسلوب ہونا بھی چاہئے، مگر حافظ اسلم جیراج پوری نے حافظ محمود شیرانی سے دس سال پہلے شعرالعجم پر سخت تنقیدی مضمون لکھا بلکہ شبلی کی زندگی میں لکھا، وہ عربی کے ساتھ فارسی شعروادب اور تحقیق وتنقید کے مردمیداں تھے، ان کی تحقیقات سے اہل علم واقف ہیں، انھیں تحقیق کا معلم اول کا درجہ کیوں نہ دیا جائے، اوران کی تنقید شعرالعجم کو اتنی اہمیت کیوں نہیں دی گئی ایسا سوچا بھی نہیں جاسکتا کہ رشید حسن خاں جیسے دیدہ ور محقق اسلم جیراج پوری اور ان تنقیدات سے ناواقف رہے ہوں گے۔ دراصل ردعمل کی اصل وجہ شیرانی صاحب کی پشت پناہی کررہے بابائے اردو مولوی عبدالحق کی وجہ سے تھی جنھوں نے شبلی کے ہر کام میں کیڑا نکالنا جو اگرچہ ان کے شان متانت اور مرتبہ کے خلاف تھا تاہم اسے انھوں نے اپنا وطیرہ بنالیا تھا۔

آخر میں انھوں نے شیرانی صاحب کی کتاب ''پنجاب میں اردو'' پر تبصرہ کیا ہے اور ان میں تقریباً انھیں غلطیوں کی نشاندہی کی ہے جو ان سے پہلے کے محققین سے سرزد ہوئی تھی۔ اس میں خاص طور پر انھوں نے طے شدہ نظریہ کی بات کہی ہے اور درحقیقت تحقیق کوئی طے شدہ بات نہیں ہوتی، رشید حسن خاں نے تو یہ بات نہیں لکھی مگر حقیقت یہی ہے کہ تنقید شعرالعجم میں اسی کمزوری کی وجہ سے شدید ردعمل ہوا تھا۔

آخر میں خاں صاحب نے بڑی سچی بات کہی ہے کہ:

> ''قابل اعتراض ناقابل قبول بات جو بھی کہے وہ مولانا شبلی ہوں یا حافظ محمود شیرانی اس کو واضح طور پر رد کرنا اور افادیت کو برقرار نہیں رکھ پائے گا۔''
> (ایضاً ص ۵۴۱)

۱۹۸۲ء میں رشید حسن خان نے موازنہ انیس ودبیر کو مرتب کیا جسے مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کیا، یہ شبلی کے حوالہ سے ان کا دوسرا ادبی کام تھا، رشید حسن خاں صاحب ہمارے عہد کے سب سے بڑے محقق ومدون تھے، انھوں نے خاص طور پر متنی تحقیق میں جو کاوشیں کی ہیں امید نہیں کہ برسوں کوئی ان کا ہم سر پیدا ہوگا۔ لیکن موازنہ انیس ودبیر میں انھوں نے اپنا حق ادا نہیں کیا، وہ موازنہ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ''موازنہ انیس ودبیر پہلی بار ۱۹۰۷ء میں مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوا تھا، نسخہ جامعہ کی بنیاد اسی ایڈیشن پر رکھی گئی ہے، اصل نسخے میں اشعار کا متن متعدد جگہ مشکوک معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں کوئی تصرف نہیں کیا گیا ہے۔
>
> اشاعت اول کے سرورق پر کتاب اور مؤلف کا نام اور کتاب سے متعلق جو عبارت چھپی ہوئی ہے اس نسخے کے اندرونی سرورق پر اس کو بلفظہ نقل کردیا گیا ہے''۔ (تعارف موازنہ انیس ودبیر ص ۸)

مولانا صدرالدین اصلاحی۔حیدرآباد

ایمان بالآخرت

مصالحت کا فریب

انکار وتکذیب کے اس سارے جوش وخروش کے باوجود منکرینِ حق کی جانب سے داعیانِ حق کے جواب میں ظاہر کیا جاتا رہا ہے، جزائے اعمال کا تصور کم از کم وہ اپنے لاشعور سے بالکل فنا نہ کرسکے اور رہ رہ کر یہ احساس ان کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹک ہی جایا کرتا تھا کہ ایک باشعور، باعقل اور بااختیار مخلوق ہوتے ہوئے ہماری زندگی نے غائت اور غیر مسئول کیونکر ہوسکتی ہے۔ نیز اس کائنات کے خالق اور پروردگار کی صفات عدل وحکمت سے جو چیز زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ وہ یہی ہے کہ وہ ایک یوم حساب برپا کرے، چنانچہ مشرکینِ عرب کی یہی ذہنی کش مکش تھی جس کی کلام الٰہی نے ان لفظوں میں نقاب کشائی فرمائی ہے۔ عَمَّ يَتَسَاءَلُوْنَ، عَنِ النَّبَإِ الْعَظِيْمِ، الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ (النبا) ''یہ لوگ کس شے کے بارے میں باہم پوچھ گچھ کرتے رہتے ہیں؟ اس بڑی خبر (یعنی قیامت) کے بارے میں جس میں ان کی رائیں مختلف ہیں'' دوسری جگہ صاف صاف یوں فرمایا کہ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ (النمل ٦٦) ''بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس آخرت کے بارے میں ان کا علم گنجلک ہے''۔

ایک طرف ان کے بارے میں قرآن کی شہادت یہ ہے کہ ان کا علم گنجلک ہے، وہ کوئی قطعی فیصلہ اس کے متعلق رکھتے ہی نہیں۔ دوسری طرف قرآن ہی میں ان کے غوغائے انکار کا یہ عالم ہے کہ گویا ان کے نزدیک قیامت کا آنا اور حساب کتاب کا لیا جا بداہتہً ناممکن ہے۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان دونوں باتوں میں تضاد ہے، لیکن حقیقت میں کوئی تضاد نہیں اور اگر کوئی تضاد بھی ہے تو چنداں قابلِ حیرت نہیں۔ غیر سنجیدہ، مفاد پرست، بے اصول اور محروم ہدایت دنیا میں اس سے بھی زیادہ عجیب وغریب تضاد واقعات کی صورت میں نمودار ہوئے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قیامت کے بارے میں ان کے ذہن کے اندر دو مختلف قسم کی نفسیات کش مکش کررہی تھیں، ان کے احساسِ فطرت اور ان کی خواہش میں ایک مسلسل جنگ برپا تھی، ایک طرف تو وہ انسان تھے اور سارے بنی نوع انسان کی طرح عقل وتمیز کی صلاحیتیں رکھتے تھے۔ یہ صلاحیتیں ان کو عقل کے واضح تقاضوں اور کائناتِ عالم کے گوشہ گوشہ میں پھیلی ہوئی آیاتِ فطرت پر اضطراراً متوجہ کرتیں اور وہ رہ رہ کر ان کے اندر قیامت کا بھیانک چہرہ دیکھنے پر مجبور ہوجاتے۔ دوسری طرف جانوروں کی سی غیر ذمہ دارانہ طرز زندگی کا عشق زور دیتا کہ اس دیکھی ہوئی حقیقت کو ان دیکھی بنادے اور پھر جب قرآن اپنے تیز وتند لہجہ میں ان کی قیامت کی طرف متوجہ کرتا تو جوشِ مخالفت میں ان کا پہلا احساس بالکل ہی مضمحل ہوجاتا اور دوسرا پوری طرح ابھر آتا اور ایسے قطعی انداز میں امکان قیامت کی مخالفت بن کر نمودار ہوتا، گویا اس معاملہ میں وہ انتہائی بصیرت اور اطمینان رکھتے ہیں۔ آخر مخالفت کے جوش میں آدمی منہ سے کیا کچھ نہیں نکالا کرتا!

بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ وقوع قیامت اور جزائے اعمال کا تصور ایسا عقلی اور فطری تصور ہے کہ منکرینِ قیامت بھی اپنے دلوں سے اس کی خلش نہیں نکال سکے۔ یہی وجہ ہے کہ فکرِ آخرت سے بے نیازی کے باوجود انسان اس سے مکمل بے نیاز نہیں ہوسکتا اور اس آنے والی گھڑی کے لیے اسے کچھ نہ کچھ سوچنا ہی پڑتا ہے۔ کیا سوچتا ہے؟ یہ ایک دلچسپ سوال ہے اور فکری اور عملی طور پر جو کچھ اس کا جواب دیا گیا ہے، وہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے جو لوگ علانیہ منکرین کے زمرہ میں شامل ہیں وہ یوں سوچتے ہیں کہ وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّىْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا (کہف) ''میرا گمان تو یہ نہیں ہے قیامت آنے والی ہے، لیکن اگر ایسا ہوا اور میں اپنے رب کے حضور لوٹایا گیا تو یقیناً وہاں اس دنیا سے بھی بہتر مقام پر سرفراز ہوں گا'' گویا جب نفس کی یہ مرغوب ترین خواہش کہ اعمال کا محاسبہ نہ ہو، اپنا پورا زور دکھانے کے باوجود عقل وفطرت کے تقاضوں سے اندر ہی شکست کھانے لگتی ہے تو وہ ایک دوسرا راستہ تلاش کرتی ہے اور اپنا دام فریب لیے ہوئے براہ راست انسان کے اقوائے فہم وعقل کے پاس پہنچتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس دام کے حوالہ کردیں، اس کا آلۂ کار بن جائیں، اس کے غیر معقول اور خلافِ حقیقت مقاصد کو استدلال کی قوت نہیں تو اس کا رنگ ضرور دے دیں، تاکہ اس فطری خلش کو بھلا دیا جاسکے، جو انسانی فطرت کی گہرائیوں میں محاسبۂ اعمال کے متعلق موجود ہے، ادھر انسان کے قوائے فکر ونظر کا حال یہ ہے کہ اگر اللہ پرستی کی روشنی اور ایمان کا نور ان کی رہنمائی نہ کرے تو وہ بہت جلد غلط راہوں پر جا بھٹکتے ہیں اور نامعقول سے نامعقول افکار ونظریات کا شکار ہورہتے ہیں، منکرِ آخرت کا اندازِ فکر ایک ایسا ہی محروم انوار انداز فکر ہے، چنانچہ جب فطری، وجدانی اور عقلی دلائل نے قیامت کا تصور خواہی نہ خواہی سامنے کر ہی دیا تو اُس نے اپنے قوائے فکر کو اشارہ کیا اور تعمیل حکم میں انہوں نے ایک ایسا فلسفہ تیار کردیا، جس کے سہارے آخرت کو دیدۂ بصیرت سے دیکھ لینے کے باوجود اس کو اس کی ساری ہولناکیوں سے اور اس کے تمام اندیشوں سے نجات مل گئی اور عقل واستدلال کی سند کے ساتھ مل گئی۔ انہوں نے اسے بتایا کہ اگر قیامت آئی بھی تو تمہیں کیا غم؟ اس وقت بھی تمہارے لیے عیش ہی عیش ہوگا، اس لیے کہ تم پر اللہ کی نظر کرم ہے۔ اس ثبوت یہ ہے کہ آج تم دنیا میں خوشحال ہو، ورنہ اگر تم سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا تو اس طرح تم پر اپنی نعمتوں کی بارش کیوں کرتا؟ کہیں اپنے دشمن اور مبغوض کے ساتھ بھی ایسا سلوک کیا جاتا ہے؟ غور فرمایئے کہ بات کس طرح بن گئی اور نفس کو کیسی تسلی مل گئی! خواہشِ نفس اور حُبِّ دنیا نے اس کی عقل سے کہا بس ذرا دیر کے لیے ایک حقیقت سے آنکھیں میچ لو، اور اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے درمیان میں چند لمحوں کے لیے معقولیت پسندی پر اصرار چھوڑ دو، یعنی کائنات کے سارے اسرار پر جی کھول کر دادِ فکر وتحقیق دو، مگر بنی آدم کی دنیوی زندگی میں جو حکمت ابتلا (رکاوٹ) کام کررہی ہے، اسے بھول جاؤ، پھر میرا کام بنا جاتا ہے۔ اب مجھ کو لاکھ سمجھائے کہ اس دنیا کے اندر کام کرنے والے قوانین دوسرے ہیں اور اس عالم میں دوسرے ہوں گے۔ یہاں رزق کا معاملہ اتباع حق اور پیروی باطل کی بحث سے جدا ہے، اس لیے دنیوی خوشحالی کو اللہ کے تقرب کی نشانی اور دلیل نہ سمجھ، مگر مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوگی، اس لیے کہ میرے پاس اس کے خلاف ''عقلی استدلال'' کی ڈھال ہوگی۔

مولانا انصار احمد معروفی ۔ پورہ معروف، بلوہ، کورتھی جعفر پور، ضلع مئو۔ یوپی

پانی، مذہبِ اسلام اور صحت

صاف پانی اللہ تعالی کی بہت بڑی نعمت ہے جس کا کوئی متبادل نہیں، جسے پیدا نہیں کیا جاسکتا، ختم ہوجائے تو پھر بنایا نہیں جاسکتا۔ اس دنیا میں زندہ رہنے کے لیے سب سے بڑی چیز صاف پانی ہے، اس کے بغیر زندگی کا تصور محال ہے، اللہ تعالی نے اس عام ضرورت کی چیز کو اپنے فضل سے اتنا ہی عام بنا رکھا ہے، جس کا حصول بھی آسان ہے اور اس کا استعمال کرنا بھی آسان ہے۔ کسی کو کھانا اگر ایک دن نہ ملے تو وہ زندہ رہ سکتا ہے لیکن اگر پانی نہ ملے تو زندگی خطرے سے دوچار ہوجائے گی اور موت سامنے کھڑی نظر آنے لگے گی، اگر انسان قدرت کی عطا کی ہوئی چیزوں کا صحیح صحیح استعمال کرے، پانی کی حفاظت کرے، درختوں کی بے تحاشہ کٹائی نہ کرکے ماحول کے توازن کو برقرار رکھے، جنگلات کو آباد اور گھنا رہنے دے، جس سے قدرتی جانوروں کو زندگی گزارنے اور اپنا سر چھپانے کے لیے در در کی ٹھوکریں نہ کھانی پڑے، کہ ان کی بددعائیں انسانوں کو لگ جائیں؛ تو پھر ماحول میں جہاں آلودگی نہ بڑھے گی وہیں بارش وقت پر ضرورت کے مطابق ہوتی رہے گی اور کبھی پانی کی قلت یا پانی کی آلودگی کی شکایت نہ رہے گی، ندیاں اور نالے، جھیل اور تالاب صاف ستھرے بہا کریں گے، نہ ان کی صفائی کی ضرورت پڑے نہ ان پر کروڑوں روپئے صفائی بیداری کے لیے پانی کی طرح بہانے پڑیں۔

اللہ تعالی نے پانی کا صرف ایک ذریعہ بنایا ہے، اور وہ بارش کا پانی ہے، جو ہمارے ملک ہندوستان میں نصف جون سے نصف اکتوبر تک برسات کے موسم میں ہوتی رہتی ہے، کہیں کہیں اس سے بھی کم صرف دو ماہ ہی بارش ہوتی ہے، اور کہیں سوکھے اور قحط کا سامنا کرنا پڑجاتا ہے، اس لیے ہمیں پانی کی حفاظت اور اسے خراب ہونے سے بچانے کے لیے قدم بڑھانا ہوگا اور دیکھنا ہوگا کہ اللہ نے اس کے بارے میں کیا کیا ارشاد فرمایا ہے، نیز یہ کہ پانی کا استعمال ہمیں کس طرح کرنا چاہیے؟

قرآن میں اللہ نے پانی کی اہمیت کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے ''وجعلنا من الماء کل شیء حی افلا تبصرون'' یعنی ہم نے پانی سے ہر چیز کو زندگی بخشی ہے، کیا تم اس کو دیکھتے نہیں؟ پانی کے بغیر نہ تو غذائی اجناس تیار ہوسکتی ہے اور نہ ہی کوئی چیز، اسے اللہ نے زمین کے اندر اس کی مسامات کے ذریعے پائپ لائن کی طرح بچھا دیا ہے اور زمین کے اندر اسے محفوظ کردیا ہے تاکہ بوقت ضرورت اسے نکالا جاسکے اور اس سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔ چنانچہ فرمایا گیا ''ہم نے آسمان سے بارش کا پانی اتارا، پھر اسے زمین کے اندر چشموں کے ذریعے ادھر ادھر پھیلا دیا ہے، جس سے کھیتیاں اگتی ہیں اور اس سے پھل اور مختلف قسم کے میوے تیار ہوتے ہیں، جو انسانوں کے ساتھ جانوروں کی غذا کا سامان بنتے ہیں''۔ کہیں یوں فرمایا کہ ''پانی سے ہم نے کھیتیوں کو زندہ کردیا، اور وہ زمین جو خشک تھی، اسے ہم نے پانی کے ذریعے زندہ کردیا، اسی طرح ایک دن ہم مُردوں کو بھی زندہ کردیں گے۔

الغرض یہ پانی اللہ تعالی کی نازل کردہ بیش بہا نعمت ہے، نعمت کی جب قدردانی ہوتی ہے، اور اس کا شکر ادا کیا جاتا ہے تو اللہ پاک اس نعمت میں اضافہ فرماتے ہیں اور اس کی ناقدری کی صورت میں اسے لے لیتے ہیں، اسی لیے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ پانی کو گندا مت کرو، اس میں پاخانہ پیشاب مت کرو، لیکن آج اللہ کی اتنی بڑی نعمت ندی اور نالے میں ہم اپنی ملک کی ساری غلاظت بہا کر اسے ناپاک اور گندا کرچکے ہیں، جس کے وجہ سے ساری ندیاں

آلودہ اور گندگی سے بھر جانے کی وجہ سے نا قابل استعمال ہو چکی ہیں، اور اس کی صفائی کے لیے بیشمار دولت خرچ کی جارہی ہے، مگر صفائی کے مقابلے میں اس میں گندگی اس سے زیادہ بدلے میں ڈال دی جاتی ہے، اس طرح قدرت کی چیزوں کے ساتھ ہمارا ناروا سلوک برسوں سے جاری ہے، غم کی بات یہ کہ وہ ندیاں جو بہت مقدس اور متبرک مانی جاتی ہیں، اسے بھی ہم نے صاف نہیں رکھا اور اس کو اپنی گندگی کے بہانے کا ذریعہ بنادیا، دوسری جانب درختوں اور جنگلات کی کٹائی نے ماحول کے توازن میں گڑبڑی پیدا کردی جس سے بارش کم ہونے لگی، بارش کی کمی کی وجہ سے زمین کا وہ پانی جس کی سطح پہلے بہت اوپر تھی وہ انتہائی نیچے چلی گئی، اللہ نے فرمایا ''قل ارئیتم۔۔ بتاؤ اگر زمین کا پانی بہت اندر چلا جائے تو اسے کون دوبارہ نکال سکتا ہے؟ اور کون پھر پانی میٹھا چشمہ جاری کرسکتا ہے؟

اس کے علاوہ ہم نے وہ پانی؛ جو زمین سے نکل رہا ہے، جب سے یہ پانی موٹر اور ٹیوب ویل سے نکالا جارہا ہے، یا میونسپلٹی کے ذریعے ہمارے گھروں تک ٹنکیوں کے واسطے سے آرہا ہے، اسے ہم نے بے تحاشہ ضرورت سے زیادہ خرچ کردیا ہے، جب تک پانی کنوئیں اور ہینڈ پائپ سے مل رہا تھا اور مشقت سے بھرا جاتا تھا، تب تک اسے بقدر ضرورت گرایا جاتا تھا لیکن جب سے وہی پانی موٹر کے واسطے سے نکلنے لگا، اسے ہم نے ضائع کردیا، کبھی ہم ایک لوٹے پانی سے وضو کرلیا کرتے تھے، آج اسی ضرورت میں ٹنکی سے لینے کی صورت میں کئی لوٹے خرچ ہو جارہے ہیں، یہی حال غسل کرنے اور کپڑے دھونے، مکان کی صفائی اور دوسری چیزوں کے دھونے کا ہے، اسی لیے حدیث میں آیا ہوا ہے کہ نبی ﷺ ایک صاحب کے پاس سے گزرے، وہ پانی میں فضول خرچی کررہے تھے، آپ نے ٹوکا تو انہوں نے تعجب سے کہا کہ کیا وضو میں بھی اسراف مانا جاتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں چاہے تم بہتی نہر سے وضو کررہے ہو، جس کا پانا نہر ہی میں گر رہا ہو، مگر یہ بھی فضول خرچی میں داخل ہو جاتا ہے۔

معلوم ہوا کہ پانی کو بقدر ضرورت استعمال کرنا چاہیے، اسے بے ضرورت بہانا نہیں چاہیے، کیوں کہ اللہ کے نزدیک اس کا بھی حساب دینا ہوگا، مذہب اسلام میں ''پانی ہی زندگی ہے'' کا پہلے پہلے فارمولا پیش کیا ہے اور قرآن میں ذکر کردیا ہے جیسا کہ مضمون کے شروع میں گزرا ہے۔

اب یہ پانی ہمارے لیے کیسے مفید اور صحت بخش ثابت ہوگا، اس کا اصول طب میں بتایا گیا ہے۔ جس کے مطابق اگر پانی کو استعمال کیا جائے تو وہ پیاس بجھانے کے علاوہ صحت کے اصول کے اعتبار سے بھی نفع بخش ہوگا۔ یہ معلومات پانی کی حفاظت کے مشیر اردو کے سائنس نگار پروفیسر نصرت جمال صاحب نے اپنی کتاب ''دانا پانی'' میں دی ہے۔

''صحت مند رہنے کے لیے کچھ رہنما اصول ذکر کیے گئے ہیں، مثلاً اوسطاً ایک آدمی اپنے وزن کے حساب سے پانی پیے اگر ایک آدمی کا وزن ۶۰ر کیلو گرام ہے، تو اسے ایک دن میں 4.070 کیلوگرام پانی پینا چاہیے۔ پانی صاف ہو، اگر آلودگی کا شبہ ہو تو ابال کر، یا چھان کر یا اسے فلٹر سے صاف کر کے استعمال کرنا چاہیے۔ صبح اٹھ کر دو گلاس پانی پی لیں، بہتر ہے کہ یہ کچھ گرم ہو، ٹھنڈا ہرگز نہ پئیں۔ ہلکا نیم گرم پانی پینے سے پیٹ صاف ہوگا اور ہاضمہ بھی اچھا رہے گا۔ کھانے کے بعد پانی تو بالکل نہ پئیں، لیکن کھانے کے دوران یا اس سے قبل ایک دو گھونٹ اگر ضروری ہو تو پی لیں۔ کھانے کے ڈیڑھ دو گھنٹے بعد پانی پیا جاسکتا ہے۔ اگر دوپہر کو آرام کیا ہے، یا سو کر اٹھے ہیں تو ایک گلاس پانی ضرور پینا چاہیے، رات کو کھانے کے ایک ڈیڑھ گھنٹہ بعد پینا چاہیے۔ اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے تین گھونٹوں میں بیٹھ کر پانی پینا چاہیے۔ اگر کسی بات پر غصہ ہو تو پانی پی لیں۔ اگر کچھ بھول گئے ہوں تو پانی پی لیں۔ زیادہ ٹھنڈا پانی کبھی نہیں پینا چاہیے۔ اسی کے ساتھ بہت گرم چائے بھی پینا صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ دانا پانی۔ صفحہ۔۱۳۷۔

معذورین اور ہماری ذمہ داریاں:

کچھ لوگ دنیا میں ایسے ہیں جو صحیح وسالم پیدا ہوئے، ہاتھ، پاؤں، دل ودماغ، آنکھ اور بدن کے سارے اعضا ان کے مکمل

اور صحت مند ہیں، بعد میں کسی حادثہ میں ان کے بدن کا کوئی حصہ خراب ہوگیا، مثلاً ہاتھ اور پیر کسی تکلیف دہ واقعہ کے پیش آنے میں ٹوٹ گیا، یا لقوہ اور فالج کا اثر ہوگیا، کان میں سننے کی طاقت کمزور یا ختم ہوگئی، آنکھ میں کوئی عیب پیدا ہوگیا اور بصارت متاثر ہوگئی۔ دماغ کسی حادثہ میں ہلکا یا ناکارہ ہوگیا، جس کی وجہ سے وہ صحت مند نہیں رہے، اور انہیں دنیا کے لوگ لنگڑا، اندھا، ہاف یا پاگل، یا معذور کہنے لگے۔ جن کے علاج کی گنجائش موجود ہے، اور وہ اکثر کسی اچھے اور ماہر ڈاکٹر کی صحیح تشخیص اور دوا سے صحت یاب ہوجاتے ہیں۔

مگر دنیا میں کچھ ایسے بھی معذور لوگ ہیں جو کسی حادثہ یا ناخوشگوار واقعہ کی وجہ سے نہیں؛ بلکہ وہ پیدائشی اندھے، یا مفلوج اور معذور ہیں، جو کسی علاج سے تندرست نہیں ہوسکتے، کیوں کہ ان کی پیدائش ہی ان امراض کے ساتھ قدرت کو منظور تھی۔ تاکہ ڈاکٹروں کی بھی ایک حد مقرر کردی جائے اور انہیں یہ احساس ہوجائے کہ سب کچھ ان کے ہاتھ میں نہیں ہے، یہ وہ موقع ہوتا ہے جہاں ڈاکٹروں کا علم اللہ کی قدرت کے آگے سرنگوں ہوجاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو عاجز سمجھ کر مریض کے سرپرستوں سے معذرت کرنے لگتے ہیں

لیکن معذور کوئی بھی ہو، پیدائشی ہو یا غیر پیدائشی، اکثر دیکھا گیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ان کے بدن کے کسی حصہ میں کسی وجہ سے کوئی مرض پیدا کردیا ہے تو اس کے بدلے میں اس کے دل و دماغ یا کسی اور حصہ کو اتنی زیادہ قوت عطا فرمادی جو دوسرے نارمل لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی اندھا شخص ہے، تو اس کا دماغ بہت یادداشت والا بنادیا، جو اپنی دماغی قوت سے بہت سے کام اپنی ضرورت کے دوسرے لوگوں سے زیادہ اچھی طرح کرلیتا ہے، جو بغیر دیکھے ہی کسی کی آواز سن کر پہچان لیا کرتا ہے، یا اگر کوئی ہاتھ سے لکھنے پڑھنے کے اعتبار سے معذور ہے تو وہ دماغی قوت سے پیر کے ذریعے لکھنے کا کام کرلیا کرتا ہے اور تعلیم کے میدان میں بہت سے ایسے لوگوں سے آگے نکل جاتا ہے جو ہاتھ والے ہوا کرتے ہیں، اب سائنس بھی چوں کہ کافی ترقی یافتہ ہوگئی ہے، اس لیے معذور لوگوں کو تعلیم یافتہ بنانے اور انہیں کسی کام کے لائق بنادینے کے لیے ایسی ایسی تکنیک دریافت ہوگئی ہے کہ اب اندھا بھی ابھرے ہوئے حروف کی مدد سے حروف کو نہ صرف پہچان سکتا ہے بلکہ پوری پوری کتاب پڑھ اور سمجھ سکتا ہے، اندھے لوگوں یا دوسرے معذورین کے لیے ایسے ایسے اسکول و کالج کھل گئے ہیں اور اس میں ان کو پڑھانے کے ایسے ایسے ماہر تجربہ کار کی خدمات حاصل ہوگئی ہیں جنہیں گونگے، بہرے، اندھے اور معذورین کو پڑھانے میں بڑی صلاحیت حاصل ہوا کرتی ہے، اسی لیے ایسے لوگوں کے لیے کھیل کود کے مقابلے بھی منعقد کیے جاتے ہیں، اس وجہ سے اب اندھے بھی کرکٹ، کبڈی اور دوسرے کھیل کھیل سکتے ہیں اور اپنے اندر سے احساس کمتری دور کرسکتے ہیں۔

گونگے بہرے لوگ جنہیں عموماً نادانی کی وجہ سے ہم لوگ پاگلوں کی فہرست میں داخل کرکے ان سے کنارہ کش ہوجایا کرتے ہیں، یا پھر بدن کے کسی ناکارہ عضو کی طرح سماج و معاشرہ کا ناکارہ حصہ قرار دے کر انہیں نظر انداز کردیا کرتے ہیں، اور وہ بھی اپنے آپ کو لوگوں کے تکلیف دہ رویہ کی وجہ سے دنیا پر بوجھ محسوس کرنے لگتے ہیں، چوں کہ ان کے ساتھ کبھی محبت کا معاملہ نہیں کیا گیا، ان سے نرمی اور شفقت کا برتاؤ نہیں کیا گیا، ان کے کپڑوں کی صفائی پر دھیان نہیں دیا گیا، ان کے کھانے پینے کا لحاظ نہیں کیا گیا اور دوسری بہت سی تکلیف دہ وجوہات کی وجہ سے ان میں خوف، کم ہمتی پیدا ہوگئی، جس کے تئیں کنارہ کشی اور گھر کے کسی کام میں ان سے عدم دلچسپی کا اظہار ہونے لگا، گھر پہ آئے ہوئے مہمانوں سے انہیں دور رکھا گیا، ان سے اگر کوئی کام لیا گیا تو ایسا جو حقارت والا ہو اور جسے اس گھر کے دوسرے لوگ کرنے میں حجاب محسوس کریں، اسی کے ساتھ ساتھ یہ باور کرلیا گیا کہ جو شخص معذور ہو، اپنے کپڑوں کو جو صاف نہ رکھ سکتا ہو، اپنے بدن کی صفائی سے جسے کوئی سروکار نہ ہو، جس کا دل و دماغ درست نہ ہو، اس کی دیکھ بھال پر وقت خرچ کرنا وقت کی بربادی کے علاوہ کچھ نہیں، کیوں کہ انہیں علم نہیں آسکتا اور انہیں تعلیم یافتہ نہیں بنایا جاسکتا۔

جب کہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اپنی مسلسل جد وجہد اور محکم یقین کی وجہ سے بہت سے معذور لوگ، صحت مند لوگوں سے علم وعمل میں آگے بڑھ گئے، اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے کتنے کم ہمت غیر معذورین کے لیے عمل کے لیے محرک بن گئے، انہوں نے سوچا جب ایک معذور شخص تعلیم اور قابلیت کے میدان میں اپنی مستقل محنت کی وجہ سے اتنا آگے نکل سکتا ہے، تو ہم ماشاء اللہ صحت منداور تندرست ہیں، ہمارے لیے کام کرنے کے لیے کوئی رکاوٹ اور پیچیدگی نہیں، ہم بھی کچھ محنت کر کے کسی کام کے قابل کیوں نہیں ہوسکتے ہیں؟ اور اپنے جہد مسلسل کے سبب اپنے پیروں پر کیوں نہیں کھڑے ہوسکتے ہیں؟۔

معذورین کی ترقی اور ان کی صلاحیت کی اگر بات کریں تو معلوم ہوگا کہ ہر دور میں ایسے لوگ رہے ہیں جو عذر کے باوجود بہت سے تندرستوں سے آگے ہوگئے، یا کم از کم اس قابل ہوگئے کہ لوگ ان کے عذر اور صلاحیت کو دیکھ کر دنگ رہ گئے، مذہبی اعتبار سے دیکھا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ اگر چہ اللہ نے معذورین کو بہت سے احکام سے مستثنی کیا ہے، کہ وہ اگر فلاں فلاں کام میں حصہ نہ لیں تو ان سے باز پرس نہیں ہوگی، اس کے باوجود انہوں نے رخصت کے بجائے عزیمت پر عمل کرتے ہوئے دشمنوں سے جنگ کرنے کے لیے بھی نکل گئے اور دوستوں کے ساتھ نکل کر میدان جنگ میں نمایاں کارنامہ انجام بھی دیا، ان کا اندھا ہونا مسجد میں جانے اور درس قرآن وحدیث میں شرکت سے روک نہیں سکا۔ ان معذورین میں نہ جانے کتنے حفاظ کرام اور جید قاری ہوئے، بلکہ بہترین عالم دین ہونے کے ساتھ مفتی بھی ہوئے، ابھی دس پندرہ سال کا عرصہ گزرا ہوگا جب سعودی عربیہ کے سب سے بڑے مفتی نابینا تھے، جن کا فرماں روایان مملکت بھی احترام کرتے تھے اور اپنی بغل میں ان کو جگہ دیتے تھے، ان کا نام ''بن باز'' سے مشہور ہے۔ علمائے سلف میں ایسے نہ جانے کتنے مصنفین نابینا علما تھے جن کے علم سے آج امت استفادہ کر رہی ہے، اس موضوع پر پوری ایک کتاب ''نابینا علمائے سلف'' کے نام سے شائع ہوچکی ہے۔ آج کے دور میں بھی بہت سے نابینا حفاظ، علما اور قرا موجود ہیں، جن کے ذہن کی پختگی، ٹھوس صلاحیت اور خداداد ملکہ کو سن کر لوگ حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔

معذوری کے باوجود عالمی پیمانے پر تعلیم کے میدان میں ترقی یافتہ کتنے ایسے نام ہیں جو عالمی شہرت کے حامل ہیں ان میں سماعت و بصارت سے محروم عورت ''ہیلن کیلر'' بہت مشہور ہیں، جنہوں نے نابینائی اور سننے کی طاقت سے محرومی کے باوجود بی اے تک تعلیم حاصل کی اور پھر بہترین معلمہ اور قلم کار بنیں۔ ابھی سال گزشتہ انتقال کر جانے والے مشہور سائنس داں ''اسٹیفن ہاکنس'' بھی ایک مثالی شخص ہیں جو چلنے پھرنے سے مکمل معذور، ہاتھ پاؤں ہلانے سے قاصر، بولنے کی قوت سے محروم، مگر دماغ پوری طرح سے صحت مند ہونے کی وجہ سے کیمبرج یونیورسیٹی میں ایک شعبہ کے صدر رہ چکے ہیں، ہندوستان میں بھی بہت سے لوگ معذوری کے باوجود؛ جنہیں ہاتھ سے لکھنے کی قدرت نہیں، مگر امتحانات میں پیر سے لکھ کر اچھے نمبروں سے کامیاب ہورہے ہیں۔ بلکہ کتنے پیر سے معذور ہوتے ہوئے بھی تیراکی میں ماہر ہوگئے اور اس کے مقابلے میں حصہ لے کر حوصلہ مندی کی مثال قائم کردی۔ معذور افراد کی ایسی بے شمار کہانیاں حقیقت پر مبنی ہیں جن کے واقعات کو سن کو دانتوں تلے انگلی دبانی پڑ جاتی ہے۔

ہمارے معاشرے میں بہت سے لڑکے یا لڑکیاں سستی اور کاہلی نیز غفلت کی وجہ سے بغیر کسی معذوری کے پست ہمت ہوکر اپنے حوصلے ہار جایا کرتے ہیں، کبھی ناکامی کے زیر اثر احساس کمتری میں مبتلا ہوکر ہمیشہ کے لیے اپنے آپ کو تعلیم یا سخت جد وجہد سے کنارہ کشی اختیار کرلیا کرتے ہیں۔ ان کے لیے معذورین کی یہ بلند ہمتی اور اعلیٰ کارکردگی کچھ سوچنے اور عمل پر کھڑا کرنے کی ترغیب دے سکتی ہے۔ ہم نے ایسے بہت سے معذورین کو دیکھا ہے جو گونگے بہرے یا اندھے ہیں، یا کسی اور عذر کے شکار ہوگئے ہیں، مگر جب ان سے ملاقات کر کے ان سے نرمی سے پیش آیا گیا، ان کو قریب کر کے ان سے محبت ظاہر کی گئی تو انہوں نے اشارے میں بتایا

کہ آج تک ایسی محبت کا معاملہ ان سے کسی نے بھی نہیں کیا، بلکہ گھر والے بھی ان سے دوری بنائے رکھا کرتے تھے، جس کی وہ شکایت بھی کسی سے نہیں کر سکتے تھے، ان پر جب محنت کی گئی، ان کو اشاروں اشاروں میں کلمہ سکھا کر نماز کے لیے کھڑا کیا گیا تو بے چارے مارے خوشی کے اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پا کر بلک بلک کر رونے لگے کہ اب تک کسی نے ان کو اس طرف توجہ نہیں دلائی، اور آج وہ پہلی بار اپنے سر کو اللہ کی بارگاہ میں جھکا رہے ہیں، جب قرآن شریف ان کے سامنے پڑھا جانے لگا تو اپنی جہالت اور اب تک کی محرومی کی بنا پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، اپنا ہاتھ قرآن پاک پر رکھ کر پھیرنے لگے، اسے اپنے سینے سے لگانے لگے اور اشاروں میں کہنے لگے کہ یہ میرے رب کا کلام ہے، میرے اللہ کا کلام ہے۔ ہم نے ان گونگوں بہروں کی تقریر بھی اشاروں میں سنی، جس کا پھر ترجمہ سنایا گیا۔ اگر کسی زبان کو عالمی زبان کہا جا سکتا ہے تو وہ ''اشاروں کی زبان'' ہے معلوم ہوا کہ اگر ان پر محنت کی جائے تو وہ اپنے اپنے ہم زبانوں میں بھی جا کر دین کا کتنا کام کر سکتے ہیں۔

ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اپنے ارد گرد کے معذورین اور ان کے سرپرستوں سے مل کر ان کا حوصلہ بڑھائیں، ان میں احساس کمتری نہ پیدا ہونے دیں، ان کو تعلیم کے میدان میں آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کریں، ان کے ساتھ نارمل بچوں سے زیادہ محبت اور شفقت سے پیش آئیں، انہیں نظر انداز کرنے یا حقیر و ناکارہ سمجھنے کے بجائے ان سے قربت پیدا کریں، ان سے پیار کا احساس جگائیں، ان کے کپڑے وغیرہ صاف ستھرا رکھنے کی کوشش کریں، مہمانوں سے انہیں دور نہ رکھیں، اور اپنے دل میں یہ بات اچھی طرح بیٹھا لیں کہ ان معذورین کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہمیں بھی رزق عطا فرما رہا ہے، کیوں کہ حدیث میں ہے، جب ایک صاحب نے گھر کے ضعیف اور معذور کی دیکھ بھال وغیرہ کے بارے میں سوال کیا تو نبی ﷺ نے فرمایا کہ (ان کو اپنے اوپر تم لوگ بوجھ سمجھ رہے ہو، جب کہ) تم لوگوں کو انہی کمزوروں اور مجبور لوگوں کے طفیل رزق دیا جا رہا ہے۔ اس لیے کون جانتا ہے کہ ہم جن کو نظر انداز کر رہے ہیں، ان ہی کی برکت سے ہم کھا پی رہے ہیں۔ پھر کیوں ان سے دوری رکھی جائے، یا ان سے نفرت کی جائے؟ ایسی حالت میں ایسے گھر والوں اور ان کے سرپرستوں کا امتحان مقصود ہوتا ہے اور رزق رسانی بھی۔

ہر جگہ ایسے معذورین کی تعلیم و تربیت کے لیے بڑے بڑے ادارے کھل گئے ہیں، نیز ان کی تعلیم و تربیت، لباس و خوراک اور دوسری قسم کی مدد کے لیے سرکاری طور پر بہت سی سہولتیں مہیا کرائی جاتی ہیں، ہندوستان میں بھی ایسے حضرات کے لیے بڑی بڑی رقمیں پاس کی جاتی ہیں جو ایسے لوگوں پر خرچ کی جاتی ہیں تاکہ انہیں معاشرہ میں عزت کا مقام دیا جا سکے اور وہ اپنی روزی روٹی کے لیے کسی کے محتاج نہ رہ جائیں اور بہت سے جاہل لوگوں کی طرح گھر سے باہر سڑکوں اور مزاروں پر جا کر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے والے نہ بنیں، جنہیں لوگ حقارت سے دیکھ کر گزر جاتے ہیں یا پھر ان کے ہاتھ میں کچھ ڈال دیتے ہیں۔

اسی وجہ سے ہر سال ۳؍دسمبر کو ''عالمی یوم معذور'' InterNational Day OF Persons With) Disabilities) منایا جاتا ہے تاکہ ایسے لوگوں پر پوری توجہ دی جا سکے اور ہر خاص و عام میں ان کے تعلق سے بیداری لائی جا سکے۔ اسے بین الاقوامی سطح پر ۱۹۹۲ء سے ادارہ اقوام متحدہ فروغ دے رہا ہے، ۱۹۸۱ء کو ادارہ اقوام متحدہ کی جانب سے ''معذور افراد کا بین الاقوامی سال'' قرار دیا گیا، اس بات کا اعلان ۱۹۷۶ء میں کیا گیا تھا، اس کا مقصد معذور افراد کو بھی سماج میں باز آباد کرنا اور انہیں ایک باوقار درجہ دلانا ہے، اس کے ساتھ ہی ۱۹۸۳ء۔ ۱۹۹۲ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی جانب سے ''معذور افراد کا اقوام مرحدہ کا دہا'' قرار دیا گیا تھا۔ اس دن کا مقصد معذوروں کے مسائل اور معذور افراد کے بنیادی حقوق کے تئیں بیداری لانا ہے، جو معذور افراد کو سماج کے دھارے سے جوڑنے کے لیے بہت ضروری ہے۔

بشکریہ zbc۔

محمد تنظیم عالم ۔پی ایچ ڈی اسکالر،شعبۂ ترجمہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

علامہ سید سلیمان ندوی کا تاریخی شعور

بیسویں صدی عیسوی میں جن عظیم شخصیات نے اپنے علم وفن کے ذریعے قوم وملت کی خدمات کا عظیم فریضہ انجام دیا ہے ان میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کا نام سرفہرست ہے ۔وہ عہد آفریں شخصیت کے مالک ،بالغ نظر عالم دین ، صاحب طرز ادیب،علوم قرآنی کے رمز شناس،احادیث کے پارکھ اور مایۂ ناز محقق ومصنف تھے ۔ایک طرف عالمی سطح کے سیاست داں اور عظیم مفکر ومدبر تھے تو دوسری طرف تصوف وسلوک میں اپنی کوششوں سے خلافت اور معرفت الٰہی کے مقام پر فائز تھے ۔ جس طرح علمی تنقید وتبصرہ،تصنیف وتالیف،تحقیق وتدوین میں ان کی عظمت کا اعتراف سبھوں نے کیا ہے اسی طرح ان کی تاریخی بصیرت،شعروشاعری،صحافت وخطابت اور انشا پردازی مسلّم تھی ۔وہ لکھتے تھے اور خوب لکھتے تھے ، انداز نہایت سادہ،سلیس اور عام فہم ہوتا تھا، بھاری بھرکم اور غیر مانوس الفاظ سے مکمل اجتناب کرتے ،مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ مضامین کو اس طرح بیان کرتے کہ ان کے سمجھنے میں کسی طرح کی دشواری کا احساس نہیں ہوتا تھا،ان کی پوری کتاب پڑھ جایئے کہیں بھی بے ربطی کا احساس نہیں ہوگا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام جملے ترتیب کے ساتھ ایک ہار میں پرو دیئے گئے ہیں اور ایک کے بعد دوسرے جملے کی طلب ہورہی ہے۔

ویسے تو انہوں نے سوانح ،تاریخ ،تذکرہ ،علم قرآن ، ادب،صحافت اور سیاست وغیرہ درجنوں موضوعات پر لکھا ہے اور جس پر بھی لکھا ہے حق ادا کردیا ہے لیکن خاص طور پر سیرت نگاری میں انہیں جو شہرت ملی بہت کم اس کی مثالیں موجود ہیں ۔علامہ شبلی نعمانی کے زیر تربیت دینی شعور ملا،عشق مصطفیٰ اور سوز دروں حاصل ہوا اور ادھر حضرت مولانا اشرف تھانویؒ کی نگاہِ محبت نے انہیں کامل انسان بنادیا،دل میں ایمان ویقین کی ایسی کیفیت پیدا کی کہ وصال خداوندی کی تڑپ اور محسن انسانیت ﷺ کی قربت ان کی سب سے بڑی آرزو بن گئی،اِس نے سیرت نگاری میں لذت پیدا کردی ،چنانچہ علامہ شبلی نعمانیؒ کے بعد جب باقی کام ان کے سپرد ہوا تو بڑی خوش اسلوبی سے اس کی تکمیل کی،وہی انداز اور وہی اسلوب جو علامہ شبلی کا تھا انہوں نے اختیار کیا اور اخیر تک اس کو باقی رکھا،تحریر عشق نبویؐ میں ڈوبی ہوی ہے اور ہر بات میں صحت کے معیار کو ملحوظ رکھا گیا ہے،جس واقعہ میں شبہ پیدا ہوا اس کو چھوڑ دیا ہے اسی طرح واقعہ کا جتنا حصہ صحیح سند کے ساتھ مذکور ہے صرف اسی کو انہوں نے کتاب میں درج کیا ہے ۔عام طور پر سیرت،تاریخ اور وعظ و نصیحت کی کتابوں میں رطب ویابس کو جمع کردیا جاتا ہے اور صحت کا اہتمام نہیں کیا جاتا لیکن سید صاحب نے جو بھی لکھا اور جہاں بھی لکھا صحت کا مکمل اہتمام کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ بے سند باتیں کتاب میں ہرگز نہ لکھی جائیں ۔اسی لئے شاعر مشرق علامہ اقبال نے علامہ شبلی کے بعد انہیں استاد الکل،رئیس العلماء اور علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد قرار دیا تھا۔(اقبال نامہ صفحہ ۱۷ مرتبہ شیخ عطاء اللہ،دارالمصنفین اعظم گڑھ)

علامہ سید سلیمان ندویؒ سرچشمۂ عقل ودانش اور سراپا علم و فضل تھے،وہ اپنی ذات میں انجمن اور ہمہ جہت صلاحیتوں کے مالک تھے ان صفحات میں ان کی علمی خوبیوں اور کمالات کی جھلکیاں پیش کرنا بھی دشوار ہے البتہ ان کی تاریخی بصیرت اور

اس باب میں ان کی انفرادیت پیش کرنا میں مناسب سمجھتا ہوں جس کے لئے انہوں نے زندگی بھر محنت کی اور اس کو انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد بنایا تھا۔ دیگر فنون کی طرح انہوں نے تاریخی واقعات کو بھی اپنے معیار پر پرکھا جانچا اور جچے تلے الفاظ میں حقائق کو قلمبند کیا ہے۔ تاریخ اسلام اور تاریخ ہند کو خاص طور پر انہوں نے اپنا موضوع بنایا ،جب بھی کسی نے اسلام یا ہندوستان کی تاریخ بیان کرنے میں غلط بیانی سے کام لیا اور حقائق کو چھپانے کی کوشش کی یا کسی نے بے جا اعتراضات کئے تو سب سے پہلے سید صاحب کا قلم نیام سے باہر نکلا اور دوٹوک انداز میں بڑی جرأت کے ساتھ مسکت جواب لکھا کہ دشمنان اسلام یا حاسدین وطن کو خاموش ہونے اور اپنی غلطی تسلیم کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ مؤرخین کی بجا طور پر گرفت کرتے اور اپنے علم و تحقیق کی روشنی میں صحیح رہنمائی کرتے۔ ان کا کہنا تھا کہ تاریخ کسی بھی قوم کی روح ہوتی ہے ،اس کے پڑھنے سے اس قوم کے عہد کی تہذیب وتمدن اور طرز معاشرت کا منظر سامنے ہونا چاہئے۔ تاریخ صرف بادشاہوں کی تعریف ، ان کی سرگذشت اور کارناموں کے تذکرے کا نام نہیں ہے بلکہ ہر زمانے کی تاریخ اس زمانے کی تہذیبی عکاس ہوتی ہے جس کا خیال بہر حال ایک مؤرخ کو رکھنا چاہئے ،ورنہ بادشاہوں کے صرف واقعات یاد رہ جائیں گے اور نقوش و آثار کا نام ونشان نہیں رہے گا۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تاریخی بصیرت اور اس عنوان سے ان کی تاریخی کوششوں پر تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تاریخ کے علم وفن پر سید صاحب کی گہری نظر تھی ،انہوں نے اسلام اور ہندوستان دونوں کی تاریخ کا نہایت محنت اور باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا، قدیم مؤرخین اسلام کے اصول و نظریات سے واقف ہونے کے علاوہ وہ جدید مؤرخین اور ان کے اصول و طرز فکر سے بھی باخبر تھے۔ علامہ شبلی کے نظریۂ تاریخ سے ان کا متاثر ہونا فطری تھا، چنانچہ وہ اسی نظریہ شبلی کے ہمیشہ مکمل پیرو ومتبع رہے، ان کی تصنیفات میں اگر چہ کوئی مستقل کوئی تاریخ نہیں لیکن تاریخ کے متعدد پہلوؤں پر ان کی تحریریں فن واصول تاریخ کی حیثیت سے بہت اہم ہیں جن کی نمایاں خوبی اپنے عہد کے رواج کے مطابق تہذیبی وتمدنی تاریخ کا مطالعہ تجزیہ ہے ان کے سیکڑوں تاریخی مضامین میں دو ایسے ہیں جن کا تعلق خالص سیاسی تاریخ سے ہے، بقیہ مضامین خواہ وہ تاریخ اسلام یا تاریخ ہند سے متعلق ہوں ان کا تعلق تہذیبی وتمدنی تاریخ سے ہے۔

سید صاحب کا خیال تھا کہ تاریخ قوموں کی روح ہوتی ہے اور وہ صرف بادشاہوں کے کارناموں کا نام نہیں بلکہ ہر زمانے میں ملک کی عام علمی، تمدنی ، معاشرتی اور اخلاقی کیفیات کا جائزہ ہی تاریخ کا اہم موضوع ہے ،ان کو احساس تھا کہ قدیم تاریخوں کا بہت بڑا نقص رہا ہے کہ ان میں صرف سیاسی واقعات لکھے گئے اور قدیم مؤرخین نے اسی کو اصل تاریخ تصور کیا جس سے یہ نقصان ہوا کہ تہذیب وتمدن کے بہت آثار ونقوش مٹ گئے۔ تہذیب ومعاشرت کی تاریخ پر وہ اسی لئے بہت زور دیتے تھے" (علامہ سید سلیمان ندوی بحیثیت مؤرخ صفحہ ۲۔ مطبوعہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ)۔

مثال کے طور پر یہاں مؤرخین کی چند غلط بیانیاں پیش کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے جن کو علامہ سید سلیمان ندویؒ نے آڑے ہاتھوں لیا اور دیگر مصنفین کی طرح یہ خاموش نہیں بیٹھے

بلکہ جہاں تک ہوسکا حقائق بیان کرکے اپنی غیرت مندی کا ثبوت دیا اور لوگوں کے ذہن ودماغ سے تعصب کا پردہ ہٹا کر اپنا مذہبی اور قومی فریضہ پورا کیا۔ چنانچہ مسلمان بادشاہوں پر ہمیشہ غیر مسلموں کی جانب سے یہ اعتراض کیا جاتا رہا ہے کہ انہوں نے ہندوؤں کو زبردستی اسلام میں داخل کیا ہے، اسلام یا جزیہ ادا کئے بغیر انہیں ایک سکنڈ کے لئے یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کے جبر واکراہ کی وجہ سے خاندان کے خاندان اور بستی کے بستی اپنے مذہب کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہوگئے، ان کی جان ومال اور عزت وآبرو خطرے میں تھی، اس لئے اپنی جان ومال اور عزت و دولت کو محفوظ رکھنے کے لئے ان لوگوں نے ایسا کیا اور اسلام کے دامن میں پناہ لی، خوش دلی سے وہ اسلام میں داخل نہیں ہوے۔ آج ہندوستان میں ان ہی مسلمانوں کی اکثریت ہے۔

اس طرح کے متعصّبانہ خیالات اور نفرت انگیز باتوں کو پھیلانے میں انگریز مؤرخین پیش پیش تھے۔ کیوں کہ جب انہیں محسوس ہوا کہ آزادی کی لڑائی میں ہندو مسلم دونوں متحد ہیں اور دونوں مل کر انگریزوں کے ہندوستان میں محاذ قائم کئے ہوے ہیں، جب تک یہ دونوں متحد رہیں گے ہماری حکومت میں استحکام پیدا نہیں ہوسکتا خطرہ ہے کہ دونوں کے اتحاد سے ایک دن ہندوستان چھوڑ دینا پڑے۔ اس لئے کچھ انگریز مؤرخین نے ہندو مسلم اختلاف کو ہوا دینے اور دونوں کے درمیان خلیج پیدا کرنے کی طرف توجہ دی اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے اسلام اور مسلمانوں سے متعلق تاریخ بیان کرنے میں غلط بیانی سے کام لیا، ہندوستان کے مسلم حکمرانوں اور بادشاہوں کو ظالم وجابر، ہندو کش، بت شکن علوم وفنون کا دشمن ثابت کرنے کی مکمل کوشش کی، خاص طور پر بت شکنی کے فرضی واقعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا، مذہب اور عقیدہ سے تمام لوگوں کو جذباتی تعلق ہوتا ہے اور اس کے تئیں نفرت کے جو جذبات پیدا ہوتے ہیں وہ جلدی سے ختم نہیں ہوتے، انگریز مؤرخین نے اس لئے بھی مذہب اور عقائد کو چھیڑا اور اس کو ہندو مسلم کا موضوع بنایا، اس سے غیر مسلموں میں نفرت وعداوت کے جذبات پیدا ہوے، مسلمانوں سے ہندوؤں کی نفرتیں اتنی بڑھیں کہ وہ مسلم بادشاہوں کو اپنا دشمن سمجھنے لگے اور مسلمانوں کی حکومت کے بجائے انگریزوں کو ترجیح دینے لگے اور اس طرح آزادی کی جنگ متاثر ہونے لگی اور سامراجی حکومت کے خلاف جوش میں کافی حد تک کمی ہوگئی۔

سید صاحب نے انگریز مؤرخین کے منصوبوں اور ان کے دور رس اثرات کو بھانپ لیا، چنانچہ انہوں نے ایک ایک کرکے جواب دیا اور بہتر انداز میں ان کے پھیلائے ہوے نفرت انگیز خیالات کا ازالہ کیا۔ عیسائی مؤرخ مسٹر اسمتھ نے تاریخ ہند پر ایک کتاب مرتب کچس میں انہوں نے لکھا تھا کہ ''مسلمانوں نے ہندوستان آکر تلوار کی نوک سے اپنا مذہب پھیلایا اور کسی کو ایک بھاری (جزیہ) ادا کئے بغیر اپنے مذہب پر قائم رہنے کی اجازت نہیں دی'' (شذرات سلیمانی جلد۲ صفحہ ۳۰۷) یہ کتاب میواڑ یونیورسٹی اور دیگر اداروں میں نصاب میں داخل کی گئی اور باضابطہ اس کی تعلیم شروع ہوگئی۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ کو جب اس کی اطلاع ملی تو وہ بے چین ہوگئے اور اس میں بیان کئے گئے نظریات کی مؤثر انداز میں تردید کی اور انہوں نے دلائل سے ثابت کیا کہ ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت تلوار کے زور سے نہیں ہوی بلکہ اس کا فروغ بھی اسی طرح ہوا جس طرح دنیا کے دوسرے مذاہب کا ہوا یعنی اپنی مرضی اور پسند سے اس مذہب کو لوگوں نے اختیار کیا کسی نے انہیں جبر نہیں کیا ہے۔ انہوں نے ایک جگہ لکھا کہ:

> ''اوّلاً تو یہ جان لینا چاہئے کہ یہ بھاری رقم (جزیہ) کیا ہے۔ دولت مندوں سے دس روپئے اور غریبوں سے

ڈھائی روپئے، عورتیں بچے بوڑھے معذور، مذہبی اہل منصب مستثنیٰ' ثانیا کیا مؤرخ مذکور کو اس نوک شمشیر سے مسلمان کرنے کا کوئی واقعہ معلوم ہے اور اگر ہے تو کیا رومی عیسائی شہنشاہوں کی مملکت میں بت پرستوں کو اور سواحل ہند پر قبضہ کرکے ہندوؤں کو زبردستی عیسائی بنانے کے واقعات سے وہ زیادہ ہیں'' (شذرات سلیمانی جلد۲ صفحہ ۳۰۷)۔

سید صاحب نے مؤرخ کے لہجے میں ہی الزامی اور تحقیقی جواب دیا اور تفصیل سے اس پر انہوں نے مقالہ لکھ کر اس کی غلط بیانی کا پردہ چاک کیا۔ یہ پوری تحریر ماہنامہ معارف اعظم گڑھ میں ۱۹۲۴ء کے جنوری، فروری اور اگست کے شماروں میں شائع ہوی ہے۔ انہوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ یونیورسٹی کے ذمہ داروں کو ایسی متنازع کتاب نصاب میں شامل کرنے پر متنبہ کیا اور اس کے برے اثرات سے انہیں خبردار کیا اور اس کتاب کو فوری نصاب سے خارج کردینے یا اس کی اصلاح کا مطالبہ بھی کیا۔

اورنگ زیب عالمگیرؒ کا نام ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا، وہ مغل باشاہوں میں نامور، متقی اور خدا ترس بادشاہ تھے۔ دوست، دشمن، مشرقی اور مغربی تمام مفکرین انہیں زہد پیشہ اور اور متقی جانتے ہیں اور ان کے بارے میں بہتر خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں لیکن بعض متعصب انگریزوں نے غلط مقاصد کے پیش نظر انہیں مطعون اور مجروح کیا ہے اور مختلف الزامات ان پر عائد کئے ہیں۔ ہندوؤں کو ابھارنے اور ان میں جذبۂ انتقام پیدا کرنے کے لئے اورنگ زیب عالمگیرؒ کو ہندوؤں کا دشمن اور بت شکن ثابت کرنے کی ناپاک کوشش کی اور اس کو اتنا دہرایا گیا کہ انہیں ہندو کش سمجھا جانے لگا بلکہ آج تک غیر مسلموں کو ان پر سخت اعتراض ہے اور ان کے بارے میں غلط سوچ رکھتے ہیں۔

اورنگ زیب عالمگیرؒ پر جتنے بھی الزامات عائد کئے گئے ہیں اور ان کے بارے میں جو باتیں بھی کہی گئی ہیں علامہ شبلی نعمانیؒ نے ان کا مفصل جواب دیا اور ''اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر'' کے نام سے ایک رسالہ مرتب کیا جس میں علمی انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ اس رسالہ کے بعد اعتراضات کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی تاہم علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اپنے دور میں دیکھا کہ پھر وہی الزامات دہرائے جارہے ہیں اور بعض نئے اعتراضات بھی اٹھائے گئے ہیں جن کا جواب اس سے پہلے نہیں دیا گیا ہے، سید صاحب نے بحیثیت مؤرخ از سرنو ان تمام الزامات کا جائزہ لیا اور ہر ایک کے الگ الگ جوابات دیئے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے شذرات سلیمانی حصہ دوم صفحہ ۱۳۳، ۱۳۴)۔

تاج محل اور لال قلعہ کی حیثیت اقوام عالم کی نظر میں مسلّم ہے، پوری دنیا میں انہیں عجوبہ کے طور پر دیکھا اور سنا جاتا ہے، آج بھی ساری دنیا سے لوگ اس کے مشاہدہ کے لئے آتے ہیں اور ان دونوں کے نقش ونگار، طرز تعمیر اور ان کی خوبصورتی پر حیرت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہتے۔ اس کے لئے اس کا معمار اور انجینئر یقیناً قابل ستائش ہے اور اس کے دماغ کی کارکردگی سراہے جانے کے قابل ہے، یہ مسلمانوں کے لئے عظمت کی بات ہے کہ اس کا حقیقی معمار ایک مسلمان نادرالعصر استاذ احمد لاہوری ہے۔ چوں کہ ان عجیب وغریب عمارتوں کے معمار مسلمان ہونے سے مسلمانوں کا نام روشن ہورہا تھا اس لئے انگریز مؤرخین نے یہ روایت گھڑی کہ اس کا معمار کوئی مسلمان نہیں بلکہ اطالوی ماہر تعمیر تھا۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے نہایت ہی تحقیق اور جستجو سے ان مؤرخین کی تردید کی اور دلائل کی قوت سے یہ ثابت کیا کہ ان عمارتوں کے معمار کوئی اطالوی اور انگریز نہیں بلکہ مسلمان تھا۔ سید صاحب نے استاذ احمد لاہوری اور

اس کے خاندان کی تاریخ اوران کے علمی وتعمیری کارناموں کی تفصیلات پیش کیں۔معروف مؤرخ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی لکھتے ہیں:

''تاریخ میں پہلی مرتبہ اس خاندان کے مورث اعلی نادر العصر استاذ احمد معمار شاہ جہانی لاہوری کے حالات اوراس کے بیٹے لطف اللہ مہندس کی معاصرانہ شہادت سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ تاج کا معمار درحقیقت یہی استاذ احمد معمار شاہ جہانی لاہوری ہے ۔استاذ احمد ہندسہ، ہیئت اور ریاضیات کا بڑا عالم تھا ۔ان تحقیقات سے وہ تمام افواہیں جو تاج محل کے معماروں کے متعلق مشہور تھیں بے سروپا ہو گئیں''(حیات سلیمانی صفحہ۳۹۹)۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے تاریخ میں درآنے والی گمراہ کن باتوں کا ہمیشہ پردہ چاک کیا ہے اور تمام مؤرخین کو بالخصوص مسلم تاریخ نگاروں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ پوری امانت داری سے کام کریں۔کسی چیز کو لکھنے سے پہلے خود اس کی تحقیق کریں اور جب تک اطمینان نہ ہو جائے اس کو ہرگز قلمبند نہ کریں۔تحقیق مکمل ہوجانے کے بعد بعینہ اپنی معلومات لکھ کر آگے بڑھائیں چوں کہ ان کی لکھی ہوی تاریخ پر ہی آئندہ کے مؤرخین اپنی عمارت کھڑی کریں گے اور سارے لوگوں کے لئے وہی مرکز بحث ہوگی اور اسی پر اعتماد کریں گے اس لئے کسی کے دباؤ یا چاپلوسی میں آکر اپنی معلومات میں خیانت نہ کریں اور نہ کسی کی تقلید میں تاریخ مرتب کریں، یہ نازک ترین فن ہے اس کی نزاکت اور خوبصورتی سے ہمیں ہرگز کھلواڑ نہیں کرنا چاہئے۔

جامعة البنات الاصلاحية حیدرآباد (ملک پیٹ)

لڑکیوں کی اعلیٰ دینی وعصری تعلیم کا فکری واصلاحی معیاری مرکز

شعبہ جات: تحفیظ القرآن الکریم ★ شعبہ ابتدائیہ (دوسال)
★ شعبہ عالمیت (چارسال) ★ شعبہ فضیلت (دوسال)

☆شہر سے اہم مقامات سے آمدورفت کی سہولت ☆دوردراز کی طالبات کے لیے ہاسٹل کا نظم ☆عثمانیہ یونیورسٹی سے میٹرک تا ایم۔اے امتحانات دلوانے کا نظم

لڑکیوں کے لیے قرآن، حدیث، فقہ، ادب، سیرت، تاریخ کے علاوہ انگریزی زبان کے اعدادیہ تا فضیلت چھ سال تعلیم کا بہترین نظم ہے

رابطے کے لیے پتہ:
JAMIATUL BANAT AL-ISLAHIYAH
#16-3-993/1, NEAR DAWN HIGH SCOOL
OFFICERS COLONY, NEW MALAKPET,
HYDERABAD(T.S) INDIA 500036

نصب العین: انقلاب بذریعہ تعلیم قرآن وسنت کی گہری بصیرت، شہادت حق، احیائے دین کی استعداد اور امت کے لیے داعیانہ، مجاہدانہ اور قائدانہ کردار کی حامل ''المرأۃ الصالحۃ'' ٹیم کی تیاری۔
☆شعبہ تحفیظ القرآن اور شعبہ ابتدائیہ وعالمیت کے پہلے سال میں داخلے سال بھر جاری رہیں گے۔ اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے خواہشمند سرپرست حضرات سے اپنی لڑکیوں کے ہمراہ جلد رجوع ہونے کی خواہش کی جاتی ہے۔

جامعۃ البنات الاصلاحیۃ حیدرآباد کا استحکام وقت کا اہم تقاضہ اور ملی فریضہ ہے۔اس اہم مرکز کی تعمیر وترقی ک لیے مالی اور اخلاقی تعاون فرما کر ہمارے حوصلے کو قائم رکھیں۔

ناظم: مولانا عبدالعلیم اصلاحی
موبائل 9676202819

ڈاکٹر محمد نہال افروز۔مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

قمر جمالی کے افسانے ''جنگ'' کا تنقیدی تجزیہ

حیدرآباد کی خواتین قلم کاروں میں قمر جمالی کا نام سر فہرست ہے۔قمر جمالی بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں،لیکن انہوں نے ناول، ڈرامے اور تبصرے و دیباچے بھی لکھی ہیں۔ان کے افسانے میں گھر، پریوار اور ان کے رشتوں کی بھینی بھینی خوشبو کا احساس ہوتا ہے۔انہوں نے ان رشتوں کو بہت قریب سے محسوس کیا ہے اور اسے اپنی کہانیوں کے ذریعے قاری تک پہنچایا ہے۔

قمر جمالی کی پیدائش 2/اپریل 1948ء کو حیدرآباد میں ہوئی۔ان کا اصلی نام قمر سلطانہ ہے،لیکن انہوں نے ادبی دنیا میں اپنی شناخت قمر جمالی کے نام سے بنائی۔ان کی ابتدائی تعلیم گاؤں ہی میں ہوئی۔اس کے بعد انہوں نے جامعہ عثمانیہ سے بی اے اور اسی میں ایم اے کی سند حاصل کی۔

قمر جمالی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بطور تحصیلدار آندھراپردیش کے مختلف شہروں میں اپنی خدمت انجام دیتے ہوئے اپنی ذمے داری سے سبکدوش ہوئیں۔اس وقت قمر جمالی انجمن ترقی پسند مصنفین حیدرآباد کی باضابطہ رکن ہیں اور آج بھی اس انجمن کی سیکریٹری کی حیثیت سے اپنی خدمت انجام دے رہی ہیں۔

قمر جمالی کی ادبی زندگی کا آغاز 1966ء میں ہوا۔ان کی پہلی کہانی 14 سال کی عمر میں ''اے چاند چھپ جانا'' دہلی سے نکلنے والے ہفت روزہ میگزین ''روداد حیات'' میں شائع ہوئی۔ان کی دوسری کہانی 1969ء میں ''فاصلے مٹ گئے'' کے عنوان سے دہلی ہی کے اس وقت کے مشہور رسالے ''بیسویں صدی'' میں شائع ہوئی۔بیسویں صدی جیسے معروف رسالے میں کہانی چھپنے کی وجہ سے ان کو اپنے اوپر اعتبار حاصل ہوا اور وہ دلجمعی کے ساتھ لکھنے لگیں۔اس کے بعد تو قمر جمالی کی کہانیاں روز بہ روز بڑے سے بڑے رسالوں کی زینت بننے لگیں۔ان کی کہانیوں کے اب تک پانچ مجموعے ''شبیہ'' 1990ء، ''سبوچہ'' 1992ء، ''سحاب'' 2001ء، ''زُہاب'' 2007ء اور ''صحرا بکف'' 2015ء میں منظر عام پر آئے۔اس کے علاوہ ان کا ایک ناول ''آتش دان'' کے عنوان سے 2014ء میں شائع ہوا۔قمر جمالی نے افسانے اور ناول کے علاوہ ڈرامے اور دیباچے و تبصرے بھی لکھی ہیں۔ان کے ایک ڈرامے کا مجموعہ ''سنگریزیں'' کے عنوان سے 1993ء میں اور ایک تبصروں و دیباچوں کا مجموعہ ''انعکاس'' کے عنوان سے 2012ء میں منظر عام پر آئے، جو ادبی دنیا میں اہمیت کے حامل ہیں۔

قمر جمالی بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔انہوں نے اپنے افسانوں میں نسائی مسائل پر خاص توجہ دی ہے۔ان کی کہانیوں کے کردار انقلابی عورت ہے نہ کہ باغی۔انہوں نے عورت کو گھر کی چہار دیواری سے نکال کر نئے ماحول اور نئے سماج میں مردوں کے ساتھ چلنے کے لیے ایک نئی ترغیب دی ہے۔

قمر جمالی کا افسانہ ''جنگ'' دلت مسائل پر لکھا گیا ہے۔ یہ افسانہ پونے سے نکلنے والے رسالے ''اسباق'' میں اگست 2013 میں شائع ہوا تھا۔دلت جس کی سماج میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی تھی آج وہ پنڈت کی لڑکی سے شادی کرتے ہوئے نظر آرہا ہے۔قمر جمالی کے اس افسانے میں ہریجن لڑکا اور پنڈت کی لڑکی کے عشق کو موضوع بنایا گیا ہے۔

اس افسانے کا مرکزی کردار چندن ایک ہریجن بستی

کا رہنے والا ہے۔ وہ بچپن ہی سے بہت ذہین تھا اور پڑھ لکھ کر افسر بننا چاہتا تھا، لیکن گاؤں کے بڑی ذات والے اسے پڑھنے نہیں دیتے تھے۔ پھر ہوا یہ کہ سماج سدھار کارکن کے لوگ گاؤں میں آئے اور بڑی ذات والوں کی حتی المقدور کوشش کے باجود بھی وہ گاؤں میں ڈٹے رہے۔ انہوں نے نچلی ذات کے لوگوں کو جینے کے طور طریقے سکھائے، اپنے حق کے لیے لڑنا سکھایا۔ اس کے علاوہ ان لوگوں نے سب سے زیادہ ان کی تعلیم پر دھیان دیا۔ ان لوگوں کے اندر تعلیم کا شوق بھی پیدا کیا۔ انہیں شہر لے جا کر ''درج فہرست ذات قبائل'' کے اقامت خانوں میں رکھ کر ان کی تعلیم کا آغاز کروادیا۔ ان میں چندن بھی تھا۔

تقریباً بیس سال کے بعد چندن اپنی پڑھائی پوری کر کے جب واپس آیا تو وہ صاف ستھرے لباس میں ملبوس، خوبصورت، صحت مند جسم کا مالک تھا۔ اس کے استقبال میں پوری ہریجن بستی سنواری گئی، شادیانے بجے،، بچے بوڑھے، عورتیں اور مرد سب مل کر خوشیاں منائیں۔ یہ سب دیکھ کر اونچی ذات کے لوگ پریشان اور ہراساں ہوئے اور انہوں نے اپنی جواں سال بیٹیوں پر پابندی لگادی کہ جس راستے سے چندن گزرتا ہوا دکھائی دے، اس طرف ان لڑکیوں کو دیکھنا بھی منع ہے۔

باوجود اس کے پنڈت شاستری کی بیٹی کویتا چندن سے عشق کرنے لگتی ہے اور چندن نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ جب یہ بات چندن کے باپو کو پتہ چلتی ہے تو وہ گھبرا جاتا ہے اور چندن کو منع کرتا ہے کہ تو اس چکر میں کیسے پڑ گیا۔ اگر بڑی ذات والوں کو پتہ چلے گا تو وہ تیری جان لے لیں گے۔ چندن کا باپو کہتا ہے:

''بیٹا..... یہ میں کیا سن رہا ہوں.....؟''

''کیا باپو.....؟''

''تو اور کویتا۔''

''ہاں باپو۔''

''آہستہ بول۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔''

''آپ نے تو سن لیا نہ باپو۔''

''میں تیرا باپ ہوں۔ مگر شاستری..... وہ تجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''بیٹا..... باز آ۔ نکل آ ان خرافات سے۔''

''وہ برہمن کی بیٹی ہے اور تو..... ہریجن۔ دوّیا بانی اس کی گھٹی میں پڑی ہے..... جو وہ تیرے کنٹھ سے بھی نکلی تو شراپ ہے۔ ہریجن ہے تو.....''

''سمجھ میری بات۔ پہچان خود کو ..... ہریجن ہے تو.....''

لیکن چندن کہتا ہے کہ باپو سب ہی ہری کی اولاد ہیں، سب کا بھگوان ایک ہے۔ ماس، ہڈی اور لہو ایک پھر..... پھر یہ تفرقہ کیسا۔ کسی نہ کسی کو تو بلیدان ہونا پڑیگا۔ کیا پتہ میری وجہ سے اس گاؤں سے چھوا چھوت کی لعنت ہی مٹ جائے۔ اس پر چندن کے باپو نے کہا بیٹا اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ تیری اس بے وقوفی سے تیرے ساتھ پورا ہریجن واڑہ بھی ناحق تباہ ہو جائے گا۔ گاؤں کے بارے میں سوچ کر چندن شہر چلا جاتا ہے اور وہاں جا کر ایک کالج میں لکچرر کی نوکری کر لیتا ہے۔

ایک دن چندن کے پاس اس کے باپو کا فون آتا ہے اور صرف اتنا کہتا ہے کہ بیٹا ''جلدی گھر آجاورنا'' چندن کہتا ہے ''باپو ورنا کیا۔ تم ٹھیک تو ہو۔ کیا ہوا ہے باپو۔ تم رو کیوں رہے ہو۔ باپو..... باپو کچھ تو کہو..... ادھر سے صرف ایک آواز آئی ''بیٹا جلدی آجا۔'' باپو کی ایسی گھبراہٹ بھری باتیں سن کر چندن تمام مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اپنے گاؤں واپس آگیا۔ واپس آکر گھر میں دیکھتا ہے کہ اس کے مائی باپو کی لاش پڑی ہے اور اس

کی بہن رجنی کا کچھ پتہ نہیں چل رہا ہے۔ جب وہ اندر کے کمرے میں داخل ہوا تو دھان کے بوروں کے پیچھے رجنی اور کویتا چھپ کر بیٹھے تھے۔ کویتا کو دیکھ کر چندن کی آنکھوں میں نفرت کا لاوا ابلنے لگا۔ اس کا ذمے دار وہ کویتا ہی کو مانتا تھا، لیکن رجنی کے بتانے پر اسے سچ کا پتہ چلتا ہے۔ رجنی کہتی ہے:

"تم جنگ کا اعلان کرو بھیا......! تم ایک یوڈھا ہو اور یوڈھا جنگ سے گھبراتا نہیں۔ کویتا ایک لڑکی ہو کر اتنا کچھ کر سکتی ہے......تو تم کیا کچھ نہیں کر سکتے......!!

کویتا نے ہمارے گھر کو بچانے کی بہت کوشش کی۔ اس نے نہ صرف ہمارا گھر بلکہ پورے ہریجن واڑہ کو بچایا۔ ورنہ تو یہ سارا علاقہ شمشان بن جاتا......"

رجنی کی باتیں چندن کو سمجھ میں آجاتی ہے اور وہ اکیلے ہی اس جنگ کا اعلان کرتا ہے۔ وہ ایک بہادر کی طرح اپنے ماں باپ کا انتم سنسکار کرتا ہے اس کے بعد ایک بہادر مرد کی طرح کھلے عام کویتا سے شادی کرتا ہے اور دوسرے دن SC, ST ACt کے تحت اپنے مائی باپو کے مجرموں کو گرفتار کروا کر پولیس کی موجوگی میں رجنی اور کویتا کا ہاتھ تھام کر اونچی ذات والوں کی گلیوں سے ہوتا ہوا گاؤں سے باہر نکل جاتا ہے۔

قمر جمالی کا یہ افسانہ دلت سماج کو اہم دھارے (Mainstream) میں جوڑ کر دکھاتا ہے۔ چندن ایک ہریجن ہونے کے باوجود اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے لکچرر کی نوکری کرتا ہے اور اعلیٰ ذات یعنی کہ پنڈت شاستری کی لڑکی کویتا سے شادی بھی کرتا ہے۔ اس طرح اب چندن نہ تو تعلیمی، معاشی، سماجی اور مالی طور سے پچھڑا ہوا ہے اور نہ ہی چھوا چھوت ہی رہ گیا ہے۔ وہ اب سماج کے مرکزی دھارے سے جڑ گیا ہے۔ اس طرح سماج میں چھوت اچھوت اور چھوٹی بڑی ذات کی تفریق ختم ہو جاتی ہے۔

بقیہ ص:۳۴ کا.............

جیسا کہ پہلے بھی تذکرہ کیا جا چکا ہے کہ آصف جاہیان نے متعدد عمارتیں بنوائیں اور ان پر فارسی اشعار و نثر کندہ کروائے اس کے علاوہ دوسرے بھی میدان علم میں فارسی کے بے نظیر تاریخی کام انجام دئے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آصف جاہیان نے زبان و ادب فارسی کی ترقی کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا۔

حواشی:

۱۔ تاریخچۂ زبان فارسی در حیدرآباد دکن و وضعیت کنونی آن ابوالقاسم رادفر پژوہشگر علوم اسلامی و مطالعات فرہنگی، پرتال جامع علوم اسلامی

۲۔ تاریخ فرشتہ محمد قاسم فرشتہ، ترجمہ خواجہ عبد الحی ص ۵۷۸ چاپ المیزان ناشران و تاجران کتب سنہ اشاعت ۲۰۰۸ء لاہور پاکستان

۳۔ تذکرۂ شعرای دکن محبوب الزمن حصہ اول تالیف کردہ ابوتراب محمد عبد الجبار خان ۱۳۲۹ء ص ۲۶۔۲۷

۴۔ نگاہی بہ تاریخ دکن، مجتبیٰ کرمی ص ۱۱۷

۵۔ از دیوان نواب مغفرت مکان ناصر جنگ شہید طاب اللہ ثراہ، بہ اہتمام و تصحیح آقا میرزا نصر اللہ خان دولت یار جنگ بہادر المتخلص بہ فدائی بزیور طبع آراستہ گردید، آرشیوایالت آندھرا پردیش

۶۔ مآثر دکن، علی اصغر بلگرامی ص ۳

۷۔ Landmarks of Deccan, Ali Asghar Bilgirami Pg.101

۸۔ The Deccan peninsula sanctuaryasia archived from the original on 17 Oct. 2006 Retrieved 5 Jan. 2007

۹۔ The Qutub Shahi's of Golconda Hyderabad medieval Deccan 1987 Pg. 426-427

سید حسین مھدی۔ ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

سلطنت آصف جاہی کی فارسی خدمات: ایک مختصر جائزہ

آصف جاہی حکومت کی بنیاد ۱۷۲۴ء میں منطقۂ دکن کے شہر حیدرآباد میں پڑتی ہے اس حکومت نے بھی گزشتہ حکومتوں کی طرح فارسی زبان وادب کی خدمات کو بخوبی انجام دیا۔ بادشاہان وقت نے نہ صرف شاعروں اور ادیبوں کو تشویق دی بلکہ ان کی سرپرستی اور وظیفے بھی معین کئے کثیر تعداد میں مدرسے، اسکول کھلوائے اور فارسی زبان کو عام بول چال بنائے رکھا اس دور کے ادیبوں نے ہر موضوع پر طبع آزمائی کی اور مختلف موضوع میں بہترین و بے نظیر ادبی نمونے پیش کئے اس حکومت کے بعض بادشاہ خود ادیب وشاعر ومصنف تھے جنہوں نے نظم ونثر دونوں ہی فن میں اپنی صلاحیتوں کا بہترین مظاہرہ کیا اور تاحیات فارسی زبان وادب کی خدمات انجام دیتے رہے۔

کلیدی الفاظ:

آصف جاہیان، دکن، چوتھ، کتیبے، مقبرۂ شمس العلماء پایگاہ ومسجد جودی سرزمین دکن کی تاریخی، ادبی وفرہنگی حیثیت روز روشن کی طرح واضح اور عیاں ہے۔ منطقہ دکن کی سرحدوں کے تعین مورخین کے درمیان ایک اختلافی موضوع تو ہے لیکن عرف عام میں موجودہ شہر حیدرآباد کو دکن سمجھا جاتا ہے۔ سال ۱۲۰۶ میں سرزمین دہلی پر ایک ایسی حکومت کی بنیاد پڑی جس کے اثرات صدیوں تک ہندوستان پر رہے اور جس کی باگ ڈور محمد غوری کے ہاتھوں میں تھی۔ ایک صدی بھی گزرنے نہیں پائی تھی کہ اس کی جڑیں بنگال سے سندھ وجنوب میں دریائے نرمدا تک پھیل گئی تھیں۔

علاؤالدین خلجی کی فتوحات کی وجہ سے دکن میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی جو کہ آزادئ ہند تک قائم رہی اس اثنا میں کئی حکومتوں کا وجود سرزمین دکن پر ہوا۔ جب دہلی سلطنت کا زوال ہوا تو دکن میں بہمنی حکومت وجود میں آئی اور جب بہمنی حکومت کا زوال ہوتا ہے تو دکن میں پانچ نامور حکومتیں نظام شاہیان، عادل شاہیان، برید شاہیان، عماد شاہیان و قطب شاہیان وجود میں آئیں ان میں حکومت نظام شاہی، عادل شاہی اور قطب شاہی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔

طول مضمون سے گریز بقیہ حکومتوں سے صرف نظر کر کے قطب شاہیان کا اجمالاً ذکر مناسب رہے گا اس لئے کہ جس حیدرآباد پہ آصف جاہیوں کی حکومت تھی اس کی بناء قطب شاہیوں کی بناء پر رکھی تھی تو اس طرح دونوں حکومتوں کے بیچ ایک خاص تاریخی رشتہ بھی ہے۔

اس سلسلہ کے بانی سلطان قلی قطب ملک ہیں جنہوں نے ۱۵۱۸ میں اس کی بنیاد گولکنڈہ میں رکھی اور اسی سلسلہ کا ایک بادشاہ جس کا نام سلطان محمد قلی تھا اس نے اپنی ہمسر کے نام پر ایک شہر کی بنیاد رکھی جس کا نام ''بھاگ نگر'' تھا لیکن پھر بعد میں اس شہر کے نام کو اپنی بیٹی کے اسم سے منسوب کر حیدرآباد کر دیا جہاں آصف جاہیان معروف بہ (Nizams of Hyderabad) حکومت کرتے تھے اس شہر کی شان وشوکت میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب نظام الملک آصف جاہ دوم نے ۱۷۶۳ میں اسے اپنا مرکز بنایا۔

اس شہر نے ہمیشہ سیاسی، اقتصادی وسماجی نشیب و فراز دیکھا لیکن فرہنگ وثقافت اور ادب میں ایک نمایاں کردار بھی ادا کیا آصف جاہی سلطنت کے بانی میر قمرالدین نظام

الملک کا تعلق ایک ترکستانی خانوادہ سے تھا اور ان کے آباواجداد حکومت مغل میں منصب بالا پر فائض تھے محمد شاہ رنگیلا بادشاہ مغل نے نظام الملک کو آصف جاہ کے لقب سے نواز کر اس خاندان کی عزت اور نظام الملک کے شرف کو دوبالا کر دیا۔

سیاسی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ ایک مستحکم اور مضبوط حکومت تھی نظام الملک اول کے ہاتھوں میں حکومتی اور دینی دونو امور کی باگڈور تھی اور وہی مختار کل کے ساتھ ساتھ وفادار مغل بھی تھے۔لیکن ان کے بعد چودہ سال کا حرج ومرج بھی اس حکومت کو دیکھنا پڑا جس کے بعد سے انگریزوں کی دخل اندازی حکومت میں بڑھتی گئی اور آخری زمانے تک ختم نہیں ہوئی اس سلسلہ میں فرانسوی دخل اندازی کو بھی در کنار نہیں کیا جا سکتا یہاں تک کہ حکومت کو انگریزی فوج کے لئے سکندر آباد کو آباد کرنا پڑا اور اسی وفاداری کے صلہ میں ملکہ وکٹوریہ نے G.C.S.I[1] کے لقب سے بھی نوازا۔

سماجی اعتبار سے یہ حکومت بہت مقبول رہی اس حکومت نے نہ صرف قطب شاہی حکومت کی پیروی کی بلکہ سیکیولرازم کی بنیاد کو مزید مضبوط کیا ہندو مسلم اور دوسرے فرق و مذاہب کے لوگ بڑے پر اطمینان وسکون کے ساتھ زندگی گزارتے تھے۔رسم ''ستی'' کو ختم کر کے اور عورتوں کی فوج بنا کر نہ صرف ہندو عورتوں کو بلکہ اس پوری صنف کو سماج میں وقار بخشا تعلیمی معیار کو بلند کیا جگہ جگہ اسکول، کالج، یونیورسٹیاں اور کتب خانے کھلوائے اور طلاب کے لئے وظیفہ بھی معین کئے۔ اسکول میں پڑھنے سے لیکر حصول کار تک کسی کو بھی کسی بھی اعتبار کا نہ کوئی تعصب اور نہ ہی نفرت و کینہ کا سامنا کرنا پڑتا تھا سیکیولرزم کی بنیاد اتنی مضبوط کی گئی کہ محبوب علی خان کے دور میں عوام اپنے نام کے ساتھ ان کا نام بھی جوڑنے لگی تھی۔

اقتصادی اعتبار سے یہ حکومت ہمیشہ سے مضبوط رہی ان کا اداری سسٹم بہت مضبوت اور ٹیکس سسٹم بہت ہی آسان تھا کبھی حکومت نے بحرانیت کا بھی زمانہ دیکھا خصوصاً ناصر جنگ، مظفر جنگ وصلابت جنگ کے دور میں اور اس کے بعد جب مراٹھا نے اس حکومت پر ''چوتھ'' اور دوسرے ٹیکس لگائے لیکن اس کے باوجود میدان اقتصاد میں آصف جاہیوں نے بہت ترقی کی بحرانیت پر قابو پانے کے لئے مختلف طرح کے کارخانے لگائے جیسے روئی، کاغذ و سیمینٹ کے کارخانے وغیرہ۔ کشاورزی سسٹم کو درست کیا ملکی و غیر ملکی تجارت بحری تجارت وغیرہ کو خوب فروغ دیا تحفے وتحائف کو بیت المال کے سپرد کیا جانے لگا انہیں اقدام و دور اندیشی کا نتیجہ تھا کہ ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ اس حکومت کا آخری نواب دنیا کے سروت مند ترین لوگوں میں شمار ہونے لگا۔

اس دور کو فارسی زبان وادب کی ترقی کے نقطۂ نظر سے دیکھنا بھی بہت ضروری ہے۔اس دور میں فارسی ادب کو جو بھی ترقی اور بلندی حاصل ہوئی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ہند و ایران کے درمیان کئی صدیوں کے قدیمی رشتے و رابطہ، ہندوستان میں زبان فارسی کی قدردانی مسلم حکومتوں کی استحکامی دونوں ملک کے صوفیائے کرام، طلباء، دانشمندوں، شاعروں و مصنفین کی آمد ورفت اور بادشاہوں کا ادب دوست اور ادب پرور ہونے کا ہی نتیجہ ہے۔

غزنوی حملے سے پہلے زبان فارسی کا وجود ہندوستان میں تقریباً نہ کے برابر تھا لیکن اس کے بعد خصوصاً سلطنت دہلی کے قیام کے بعد زبان فارسی کی نشوونما بہت تیزی سے ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے ہندوستان میں پھیل گئی گرچہ منطقہ دکن میں تھوڑا دیر سے پہنچی لیکن جس طرح زبان فارسی ہندوستان میں حملہ غزنوی کے بعد پہنچی بالکل ویسے ہی منطقہ دکن میں زبان فارسی کی رسیدگی علاء الدین خلجی کے حملے کے بعد ہوئی۔دکن

---

[1] Grand Command Star of India

میں بھی زبان فارسی کو وہی اہمیت و بلندی نصیب ہوئی جو اسے شمال ہند میں ملی تھی دکن میں بھی مختلف جگہوں پہ مؤسسہ و مدرسے قائم ہوئے جنہوں نے فارسی زبان اور اس کے ادب میں ایک نمایاں کردار ادا کیا ان میں ایلچ پور، گلبرگہ و دولت آباد خاص حیثیت رکھتے ہیں ۔دکن میں شمال ہند کی طرح مختلف موضوع پر کثرت سے کتابیں لکھی گئیں جس میں تاریخ، داستان، شعر، نثر، حماسی، مثنوی و حکایت وغیرہ شامل ہیں۔

دکن میں زبان فارسی کا سفر بہمنی حکومت سے آغاز ہو کر آصف جاہی حکومت پر ختم ہوتا ہے۔ اس طولانی سفر میں زبان فارسی کو کئی قدر داں اور کئی معراجیں نصیب ہوئیں اور حکومتوں کے عروج و زوال اور ان کی کارکردگیوں کو بھی اپنے دامن میں جگہ دی۔

کس کو علم تھا کہ جس زبان فارسی کا بیج دکن کی سرزمین پر ۱۳۴۷ میں بویا گیا تھا وہ زمانے کے حوادث اور حالات کے تھپیڑوں کو برداشت کرتے ہوئے ایک مضبوط تناور درخت کی صورت اختیار کر لیگا۔ اور دنیا طب، تاریخ، فلسفہ، خطاطی، نقاشی، علوم دینی و دنیاوی، قصیدہ، غزل اور رباعی جیسے ثمرہ سے بہرہ مند ہوگی۔

آصف جاہی حکومت میں زبان فارسی کو وہی منزلت نصیب ہوئی جو اسے بہمنی و قطب شاہی دور میں حاصل تھی زبان فارسی صرف سرکاری امور و دفاتر تک محدود نہیں تھی بلکہ عام بول چال کی زبان تھی۔ اور فارسی زبان کی اس ترقی کا سہرا بھی آصف جاہیان کے سر بندھتا ہے جنہوں نے زبان فارسی کے نشو نما میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا اس سلسلہ کے کئی بادشاہ خود شاعر و مصنف تھے جنہوں نے فارسی کی اعلیٰ خدمتیں انجام دیں جیسے نظام الملک آصف جاہ اول، میر احمد خان، میر محبوب علی خان و میر عثمان علی خان وغیرہ ۔ ان کے اشعار بہت ہی دلفریب، عمدہ، موضوع و موزون ہیں۔ آصف جاہ اول کے مجموعہ اشعار سے ایک غزل کے دو اشعار بطور مثال مندرجہ ذیل مذکور ہیں جس میں ان کی جدت طرازی ملاحظہ ہوں:

اشتیاق دیدن آن بیوفا داریم ما
گو کدورت در دلش باشد صفا داریم ما
از پناہ دیگران باشد پناہ ما قوی
ہر کس این جا کسی دارد خدا داریم ما

میر احمد خان فرزند نظام الملک متخلص بہ ناصر نے بھی اپنے والد صاحب کی پیروی کرتے ہوئے شعر و سخن میں طبع آزمائی اور عمدہ غزلیں لکھی ہیں ان کی ایک غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

سایہ لطف خداوند بود بر سر ما
ہست اقبال خدا داد مقیم دار ما
طالع ما است ز انوار جمالت روشن
فخر بر مہر جہان تاب کند اختر ما

اس خاندان میں شعر و سخن خاندانی ورثہ کے طور پر پایا جاتا تھا تو میر عثمان علی خان کیسے پیچھے رہ جاتے انہوں نے بھی زبان فارسی میں دل کو چھو لینے والی اعلیٰ درجے کی غزلیں لکھیں جن کو پڑھنے کے بعد قارئین کو ایک عجب طرح کا لطف و سرور طاری ہوتا ہے ان کی ایک غزل سے دو شعر بطور نمونہ پیش خدمت ہیں:

تیر بیداد تو از سینہ ما می گزرد
رود خون از مژہ ہر صبح و مساء می گزرد
عمر از کیسہ ما می رود و گل از چمن
ساقیہ زود بدہ مئے کہ ہوا می گزرد

تمام آصف جاہی بادشاہ خود صاحب علم تھے اور صاحبان علم کی قدر دانی، حوصلہ افزائی اور عزت افزائی بھی کرتے تھے۔ اس دور کے شعراء و مصنفین اور دانشمندان کا نام

رہتی دنیا تک سنہرے حرفوں سے تاریخ میں لکھا جائگا ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا جنہوں نے ہر موضوع علم میں طبع آزمائی کی اور طلاب کرام، اساتید عظام ودیگر دانشمندان علوم کے لئے ایک وسیع میدان فراہم کیا جو میدان علم کی ہر منزل پر ان کی رہنمائی کرے گا۔ اس دور کے معروف شعراء و مصنفین میں رائے کنول کشن، راجا چندو لال، مہاراجا کشن پرساد، لچھمی نرائن اورنگ آبادی، میر غلام حسین بلگرامی، شاہ تجلی و رماس کا نام پر افتخار طریقہ سے لیا جاتا ہے جن کی خدمات فارسی زبان وادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اس دور میں کثیر تعداد میں کتابیں لکھی گئیں جیسے خزانہ عامرہ، ید بیضاء، غزلان ہند، ماثر حیدری، گل رعنا، مرأۃ الہند، نخلستان و چمنستان شعراء، تزک آصفیہ، تذکرہ فردوسی وطوسی وغیرہ۔ یہ ساری کتابیں تاریخ وادب کے طلاب اور ریسرچ اسکالرس کے لئے بہت مفید ہیں۔ اس دور میں لکھی گئی دو فرہنگ بھی بہت معروف ہیں پہلی فرہنگ نظام اور دوسری آصف اللغات۔

اس دور میں فارسی کے نقوش صرف زبان و کتاب ہی تک محدود نہیں رہے بلکہ در و دیوار، محل و باغات ومختلف قسم کی عمارتوں کو بھی اپنی وسعت دامنی میں جگہ دی۔ خوبصورت غزلیں، قصیدہ، رباعی، قطعات، حکایات، تاریخ و پند ونصیحت وغیرہ عمارتوں پر کندہ کی گئیں جو آج بھی زبان فارسی کی عظمت و بلندی کی نشانی اور فارسی زبان وادب سے متعلق حکومت کی محبت وکرم فرمائیوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ آصفر جاہی حکومت میں متعدد عمارتیں تعمیر کی گئیں جو نہایت ہی خوبصورت اور بے نظیر ہیں ان میں کچھ تو بالکل سادی یعنی کسی بھی زبان کا ایک بھی کتیبہ کندہ نہیں ہے اور بہت سی ایسی عبارتیں ہیں جن پر فارسی، اردو وعربی زبان کے کتیبے کندہ ہیں اس دور کے فارسی کتیبوں کی ایک طویل فہرست ہے جو مختلف عمارتوں پہ کندہ ہیں جیسے قبر و مسجد اور کمان خوشحال خاں، مقبرۂ ماہلقا بائی، بادشاہی عاشور خانہ، مکہ مسجد، مقبرہ شمس الامراء پائگاہ، جودی مسجد۔ مقبرہ رکن الدولہ وجبلی حال وغیرہ۔

اس میں سے چند فارسی کتیبوں کا ذکر بطور نمونہ کرنا چاہتا ہوں۔

مقبرہ شمس الامراء پائگاہ:

اس عمارت میں بانی پائگاہ کی قبر ہے اور اس عمارت میں دوسری بھی قبریں ہیں جن پر فارسی کتیبے نقش ہیں جیسے خورشید جاہ بہادر، وقار الامراء، والدہ محی الدین خان حشمت النساء بیگم، جہان دار النساء بیگم و پسر وقار الامراء سلطان الملک وغیرہ جن کی قبور پہ شعر ونثر میں اور مختلف سبک میں خوبصورت کتیبے موجود ہیں لیکن فقط شمس الامراء محمد ابوالفتح کی قبر کا کتیبہ پیش خدمت ہے:

''مقبرہ حضرت جناب محمد ابوالفتح مرحوم مغفور گزر انیدہ محمد محی الدین خان خورشید جاہ بہادر ماہ محرم الحرام ۱۳۰۴''

کتیبہ کی دوسری مثال مسجد جودی سے ہے جہاں عثمان علی خان نظام ہفتم اور ان کے رشتے داروں ولواحقین کی قبریں ہیں مسجد جودی کے صدر دروازے کے سامنے وعقب کے حصہ پر کندہ شدہ کتیبہ کے اشعار کچھ اس طرح ہیں:

بحر ارواح صفا مسکن بہبودی بود
گفت بار یک نظر منظر مشہودی بود
نیست این بیت حزن بلکہ ریاض فردوس
گفت عثمان کہ ھمین مقبرہ جودی است

دوسرا کتیبہ:

شد ز جود حضرت عثمان علی شاہ دکن
مسجد جودی و قبر معصومی در آن
ھفت تاریخ بناء این مقام دل کشا
خواب گاہ شاہ زادہ سجدہ گاہ میر زبان

بقیہ، ص:۲۹/ پر.....

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم

شاہی ہلز نزد مسجد نور علی، شاہین نگر، حیدرآباد

Regd No: 180/2016

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم

زیر انتظام: شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

شاہی ہلز شاہین نگر حیدرآباد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ............................ گرامی قدر محترم! امید ہے کہ آپ اپنے متعلقین کے ساتھ بخیر وعافیت ہوں گے

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے خَیْرُکُم مَنْ تَعَلَّمَ القُرآن وَعَلَّمَہ۔ تم میں سے بہترین انسان وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔ اس حدیث سے علم اور قرآن علم کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اسی علم کی نشر واشاعت کے لئے **مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم** شاہی ہلز شاہین نگر حیدرآباد میں ۱۵؍جنوری ۲۰۱۷ء کو قائم کیا گیا تا کہ امت مسلمہ کے نونہالان زیور علم سے آراستہ ہوں اور ملک وملت کی خدمت میں وقف ہوجائیں۔ اللہ رب العزت ان مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔ آمین یارب العلمین۔

مدرسہ ہذا شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ حیدرآباد کے زیر انتظام خدمت انجام دے رہا ہے۔ مدرسہ ہذا اقامتی غیر اقامتی ہے۔ فی الحال اقامتی میں شعبہ ناظرہ، شعبہ حفظ، اردو، انگلش، حساب اور کمپیوٹر کی تعلیم کا عمدہ نظم ہے۔ کیونکہ مدرسہ ہذا کو الحمد اللہ ان علوم کے ماہرین کی خدمات حاصل ہے۔ ان شاء اللہ مستقبل قریب میں مزید وسائل کے فراہم ہونے کی صورت میں درس نظامیہ اور مختصر مدتی عالم کورس، سیرت نبویؐ، تاریخ، دستورِ ہند اور ماس کمنیوکیشن اور جنرلزم وغیرہ کے شعبہ جات قائم کرنے کا ارادہ ہے اور ایسے افراد ان شاء اللہ تیار کرنا ہے جو عربی، انگلش، اردو زبان وغیرہ پر مکمل دسترس رکھیں، تا کہ وہ اسلام کی مکمل اور صحیح رہبری کریں۔ اللہ رب العزت ان عزائم ومقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔ آمین۔

مدرسہ ہذا اور ٹرسٹ کو کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے۔ جملہ اخراجات کی ادائیگی اہل خیر حضرات کے تعاون سے ہوتی ہے، اور کوئی فیس طالب علموں سے نہیں لی جاتی ہے۔ ایک طالب علم پر ماہانہ خرچ تقریباً 2000/ دو ہزار روپے ہے۔ فی الحال مدرسہ کا ماہانہ خرچ تقریباً 80000/ اسی ہزار روپے ہے اور سالانہ 960000 نو لاکھ ساٹھ ہزار روپے ہے۔ کرونا وائرس کی وجہ سے، لاک ڈاؤن کی موجودہ صورت حال کے پیش نظر اس وقت ظاہری اسباب میں اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ ادارے کے مدرس یا کوئی خادم حسب معمول ماہِ رمضان المبارک میں آپ کی خدمت میں پہنچ سکیں، اس وجہ سے آپ سے مؤدبانہ گذارش ہے کہ نیچے دیئے گئے ادارے کے اکاؤنٹ کے ذریعہ اپنے زکوۃ، صدقات اور عطیات سے تعاون فرما کر ثواب دارین حاصل کریں مزید معلومات کے لیے نیچے دئے گئے فون نمبرات پر رابطہ کریں۔ جزاکم اللہ واحسن الجزاء۔

Bank: IDBI CURENT ACCOUNT
A/c No: 1327104000065876
A/c Name: SHIBLI INTERNATIONAL EDUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST
IFSC: IBKL0001327. Branch: Charminar

Bank: IDBI CURENT ACCOUNT
A/c Name: SADA E SHIBLI
A/c: 1327102000023922
IFSC: IBKL0001327

حافظ وقاری مفتی ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی بانی وناظم مدرسہ چیرمین: شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

Google Pay: **8317692718** WhatsApp: **9392533661**

گلزار احمد ماگرے۔ریسرچ اسکالر:سنٹرل یونی ورسٹی آف حیدرآباد حیدرآباد تلنگانہ

اردو میں نعت گوئی کا آغاز وارتقاء

مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

نعت اس صنف سخن کو کہتے ہیں جس میں حضرت محمد ﷺ کی تعریف کی جائے۔عربی میں نعت کا متبادل لفظ 'مدحِ رسول' استعمال ہوا ہے۔حضور نبی اکرمؐ کی ذات مبارکہ کی عظمت ورفعت کا بیان، آپؐ کے اخلاق حسنہ کا ذکر، آپؐ کے معجزات کا بیان نعت گوئی کہلاتی ہے۔نعت کی تعریف کرتے ہوئے فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''اصولاً آنحضرتؐ کی مدح سے متعلق نثر اور نظم کے ہر ٹکڑے کو نعت کہا جائے گا۔لیکن اردو اور فاسی میں جب نعت کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے عام طور پر آنحضرتؐ کی منظوم مدح مراد لی جاتی ہے''۔(اردو غزل نعت اور مثنوی،ص ۲۶۶)

ڈاکٹر یونس حسنی نے نعت کی تعریف ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

''ایسی تمام نظمیں جن میں رسول خداؐ سے محبت اور عقیدت کا اظہار کیا جائے یا اُن کے محاسن بیان کیے جائیں نعت کی تعریف میں آتی ہیں''۔(اردو میں نعت گوئی،ص ۸)

ان دونوں مصنفوں کو مدنظر رکھ کر ممتاز حسین نے بڑے بلیغ انداز میں اس صنف کا تعارف کرایا ہے۔انہوں نے بڑی باریک بینی سے کام لیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''میرے نزدیک ہر وہ شعر نعت ہے جس کا تاثر ہمیں حضور نبی کریمؐ کی ذات گرامی سے قریب لائے جس میں حضورؐ کی مدح ہو یا حضورؐ سے خطاب کیا جائے۔صحیح معنوں میں نعت وہ ہے جس میں محض پیکر نبوت کے صوری محاسن سے لگاؤ کے بجائے مقصد نبوت سے وابستگی پائی جائے جس میں جناب رسالت مابؐ سے صرف رسمی عقیدت کا اظہار نہ ہو بلکہ حضورؐ کی شخصیت سے ایک قلبی تعلق موجود ہو۔وہ مدح یا خطاب بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ اور وہ شعر نظم ہو یا غزل،قصیدہ ہو یا مثنوی،رباعی ہو یا مثلث،مخمس ہو یا مسدّس،اس سے نعت کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا البتہ نعتیہ کلام کی معنوی قدر و قیمت کا دارو مدار اس کے نفس مضمون پر ہے۔اگر اس کا مقصد ذات رسالتؐ کی حقیقی عظمت کو واضح کرنا اور آقائے دو جہاں کی بعثت کی جو اہمیت نوع انسانی اور جملہ موجودات کے لیے ہے اسے نمایاں کرنا ہو تو وہ صحیح طور پر نعت کہلانے کا مستحق ہے''۔(اردو میں نعت گوئی،ص ۹)

ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو بھی بات چاہیے نثر میں ہو یا نظم میں آنحضرتؐ کی مدح میں کہی جائے وہ نعت کہلاتی ہے۔اس صنف پر جس ادیب یا شاعر نے اظہار خیال کیا ہے ان تمام نے نرم پیرایا اختیار کیا ہے۔اس صنف کو لکھتے وقت بڑے محتاط انداز میں رہنا پڑتا ہے کیوں کہ

یہ اس ہستی کے بارے میں لب کشائی کرنی ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے بڑے سلیقہ مندی سے پکارا ہے۔ سورہ حجرات میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا **''یاایھاالذین امنو لا ترفعو اصواتکم فوق صوت نبیّ ولا تجھرو لہ بالقول کجھر بعضکم لبعض ان تحبط اعمالکم وانتم لا تشعرون'** [اے ایمان والو تم اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند نہ کرو اور آپؐ سے اونچی آواز میں بات نہ کرو، جیسے تم آپس میں (بات) کرتے ہو، کہیں تمہارے اعمال برباد نہ ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔] اس آیت مبارکہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو باخبر کیا کہ آپؐ کے سامنے جب بولنے کا موقع ملے تو آپؐ کی عظیم شخصیت کا خیال رکھا کرو۔ اسی لیے تمام شاعروں نے بڑی چابکدستی سے کام لیا ہے۔

نعت کے لئے شاعروں نے کوئی الگ سی ہیت استعمال نہیں کی بلکہ غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی کے ہیت میں ہی نعت کہے گئے لیکن ان میں زیادہ تر نعت گوئی کے لیے مثنوی کا پیرایا اختیار کیا گیا۔ عربی میں نعت گوئی کا آغاز بہت پہلے ہو چکا ہے اور آج بھی اس روایت میں آنچ نہیں آئی۔ عربی میں آپؐ کے چچا ابو طالب اور عروہ بن نوفل نے بھی آپؐ کی مدح کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بارہا جگہوں پر آپؐ کی مدح کی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیم

وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُولیٰ

وَرَفَعنَا لَکَ ذِکْرَکَ

عربی میں کئی نعت گو شعراء گزرے ہیں جنہوں نے آپؐ کی مدح میں کوئی کمی باقی نہیں رکھی لیکن ان میں سے جو مقام حسان بن ثابتؓ کو حاصل ہوا کسی اور کو نہیں ہوا۔ ان کو شاعر رسول کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ آپؐ جب نعت خوانی شروع کرتے تھے تو آپؐ ان کے لئے اپنی نورانی چادر بچھا دیتے تھے۔ حسان بن ثابتؓ کے چند مشہور اشعار ملاحظہ فرمائیں:

واحسن منک لم تر قط عینی
واجمل منک لم تلد النساء
خلقت مبرا من کل عیب
کانک قد خلقت کما تشاء

فارسی ادب میں بھی نعت خوانوں کی لمبی فہرست موجود ہے۔ ان میں سعدیؔ، فردوسیؔ، جامیؔ، رومیؔ، حافظؔ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ سعدی کا ایک قطعہ اتنا مشہور ہوا کہ اس کو آج بھی عموماً ہر دینی جلسے میں زبان پر لایا جاتا ہے۔ سعدی نے فارسی میں کمال حاصل کیا لیکن عربی کے ان چار مصرعوں نے ان کو دوامگی بخشی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

بلغ العلا بکمالہ　　کشف الدجےٰ بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ　　صلّو علیہ والہ

حضرت شاہ ولی اللہ کے فرزند شاہ عبدالعزیز نے بھی فارسی شاعری میں نام پیدا کیا ہے۔ ان کی نعت گوئی کے چند مصرعے ملاحظہ فرمائیں:

یا صاحب الجمال و یا سیّدالبشر
من وّجھک المنیر لقد نورالقمر
لایمکن الثناء کما کان حقہٗ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

یہ اشعار سعدیؔ، حافظؔ، جامیؔ، قدسیؔ وغیرہ کی طرف منسوب کئے گئے لیکن ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ اشعار شاہ عبدالعزیز کے ہیں۔ ان چار مصرعوں میں سے کم سے کم آخری مصرعہ ہر ذی شعور مسلمان کو یاد ہے۔ یہ

مصرعہ ضرب المثل بن گیا ہے۔ جہاں کہیں بھی اللہ تعالیٰ کے حمد و ثنا کی بات ہو رہی ہے وہاں اس مصرعے کو بھی دہرایا جاتا ہے۔

اردو نے کئی اصناف عربی اور فارسی سے مستعار لیے ہیں۔ان میں سے ایک نعت گوئی بھی ہے۔اردو کی مختلف اصناف کی طرح نعت گوئی کا آغاز بھی جنوبی ہند میں ہی ہوا ہے۔دکن کی پوری مثنویوں میں نعت گوئی پر ابتدائی نمونے ملتے ہیں۔اردو کے پہلے نظم گو شاعر خواجہ بندہ نواز گیسو دراز جن کو موسیقی میں کمال حاصل ہے، کی شاعری میں نعت خوانی دیکھنے کو ملتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اے محمدؐ ہجلو جم جم جلوہ تیرا
ذات تجلی ہوگی سیں سپور نہ سیرا
واحد اپنی آپ تھا اپیں آپ نجھایا
پرکٹہ جلوے سے کارنے الف میم ہوآیا

بندہ نواز کے علاوہ میراں جی شمس العشاق، برہان الدین جانمؒ، امین الدین علی اعلیٰ وغیرہ کے ہاں بھی نعتیہ کلام دیکھنے کو ملتے ہیں۔قطب شاہی دور نے اردو ادب کو جو بیش بہا ذخیرہ عطا کیا ہے شاید کسی اور خاندان نے دیا ہوگا۔محمد قلی قطب شاہ پہلے صاحب دیوان شاعر کہلاتے ہیں۔ان کا کلام بھی نعتیہ کلام سے مزیّن ہے۔اردو نعت کے اوّلین نمونے ان ہی کے کلیات میں ملتے ہیں۔مثال کے لئے چند اشعار:

چاند سورج روشنی پایا تمہارے نور تھے
آبِ کوثر کے شرف تھڈے کے پانی پور تھے
دیا بندے کو حق نبیؐ کا خطاب
حکم دے دیا نور جوں آفتاب

قلی قطب شاہ کے بعد ملا وجہی نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔انہوں نے قطب مشتری میں حمد کے بعد ۱۲۶ اشعار کہے ہیں۔ایک دو اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کہ چودہ ملک کا توں سلطان ہے
علیؓ سا تیرے گھر میں پردھان ہے
اسی ہور یک لاک پیغمبر آئے
ولے مرتبا کوئی تیرا نہ پائے

ملا وجہی کے علاوہ عبداللہ قطب شاہ، غواصی، ابن نشاطی وغیرہ نے قطب شاہی خاندان میں اس صنف پر طبع آزمائی کی ہے۔عادل شاہی دور میں بھی کئی نعتیہ کلام ملتے ہیں جن میں نصرتی سرفہرست ہے۔دکن کے آخری جانباز ولی اور سراج اورنگ آبادی کے یہاں بھی نعتیہ اشعار ملتے ہیں۔

شمالی ہند میں جن شاعروں نے نام حاصل کیا ہے اور شاعری کی راہ ہموار کی ان میں خاص طور پر سوداؔ اور میرؔ مشہور اور معروف ہیں۔ان کی کلام میں بھی نعتیہ کلام جگہ جگہ ملتے ہیں ۔سوداؔ کا مشہور شعر ملاحظہ ہو:

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تغمائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے زنار تسبیحِ سلیمانی

ان کے علاوہ غالبؔ، مصحفیؔ، مومنؔ وغیرہ نے بھی نعتیہ کلام کو اپنا ذخیرہ بنایا ہے۔مومنؔ کے چند نعتیہ اشعار:

محمد سزائے ستائش گری
مدیح آفرین جس کی پیمبری
یہ کیسے فنون اس کو حاصل ہوئے
کہ سارے صحف نقشِ باطل ہوئے

اردو میں مستقل اور باضابطہ طور پر نعت گوئی کا آغاز محسن کاکوروی اور امیر مینائی سے ہوتا ہے۔ان دونوں نے نعت گوئی کو ہی اپنا منزل ٹھرایا ہے۔ان سے پہلے نعت گوئی کا رواج رسمی طور پر تھا۔یعنی شاعری میں ہر شاعر حمد و ثنا کے بعد نعت کے چند اشعار کہہ کر اپنا مقصد پیش کرتا تھا لیکن ان دونوں نے نعت کو ایک صنف سخن کی حیثیت عطا کی ہے۔فرمان فتح

پوری اپنی کتاب 'اردو غزل نعت اور مثنوی' میں ان دونوں کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں:

''اُردو میں نعت گوئی کا مقبول ترین اور کامیاب ترین دور حقیقتہً محسنؔ کاکوروی اور امیر مینائیؔ سے شروع ہوتا ہے۔ دونوں قال اللہ اور قال رسولؐ کے پابند اور حُبّ رسولؐ سے سرشار تھے۔ دونوں نے نعتیہ شاعری میں ایک بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ دونوں ہم عصر اور ہم عمر ہیں اور اُردو کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی پر قدرت رکھتے ہیں، دونوں نے اگر چہ ہر صنف میں نعتیں کہی ہیں لیکن دونوں کے کمال فن کا حقیقی مظاہرہ قصیدوں اور مثنویوں میں ہوا ہے۔ دونوں نے اپنے نعتیہ کلام کو یکجا کر کے خاص اہتمام سے شائع کیا ہے اور اردو میں نعتیہ شاعری کی ترتیب اور تدوین کی نئی طرّح ڈالی ہے۔ اس طرح دونوں نے ہم عصر اور بعد کے آنے والے شعراء کو خاصا متاثر کیا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اُنیسوی صدی کے وسط سے لے کر آج تک اُردو شعراء نے نعت کے موضوع سے جس گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور جس شغف کے ساتھ اپنے کلام میں حب رسول کو جگہ دی ہے اسے اول اول بلند سطح تک پہنچانے میں محسنؔ کاکوروی اور امیرؔ مینائی ہی کا ہاتھ رہا ہے''۔(اردو غزل نعت اور مثنوی، ص ۳۰۰)

اگر چہ دونوں نے نعتیہ کلام کا بیش بہا ذخیرہ چھوڑا ہے لیکن دونوں کا موازنہ کر کے محسنؔ کاکوروی کا پلڑا ہی بھاری نظر آتا ہے۔ امیرؔ مینائی نے پہلے محسنؔ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا بعد میں نعت گوئی کی طرف متوجہ ہوئے۔ محسن کاکوروی چونکہ عمر میں تین چار سال بڑے ہیں اس مناسبت سے پہلے ان کی نعت گوئی پر ہی روشنی ڈالی جائے۔

محسنؔ کاکوروی 1825ء میں پیدا ہوئے اور 1905ء میں اس دار فانی کو خیر باد کہا ہے۔ اُردو کے جتنے شعراء آج تک گزرے ہیں ان میں محسنؔ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے نعت گوئی کا راستہ بڑی چابکدستی کے ساتھ اختیار کیا ہے۔ محسن نے ہر صنف میں اپنا لہو ہا آزمایا ہے اور نعتیہ کلام کے لیے ہر صنف مثلاً قصیدہ، رباعی، غزل اور مثنوی کو اختیار کیا ہے۔ لیکن بعد میں قصیدہ اور مثنوی کا پیرایا ہی باضابطہ طور پر اختیار کیا ہے۔ ان کو نعت گوئی کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ انہوں نے نعت گوئی کی وہ تاریخ رقم کی ہے جو اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد کہیں نظر نہیں آتی ہے۔

محسنؔ کے پانچ مجموعہ کلام منظر عام پر آچکے ہیں جن میں ''گلدست رحمت''، ''مدیح خیر المرسلین''، ''نظم دل افروز''، ''انیس آخرت'' اور ''ابیات نعت'' قابل ذکر ہیں۔ ان کا پہلا نعتیہ کلام جو بعد میں ''گلدست رحمت'' میں شائع ہوا ملاحظہ فرمائیں:

پھر بہار آئی کہ ہونے لگے سحرا گلشن
غنچہ ہے نام خدا نافۂ آہوئے ختن

نظم دل افراز میں ایک جگہ رقمطراز ہیں:

ہے منزل اک مہِ کنعاں کی قلبِ زار و مضطر میں
یہ مہمان عزیز اُترا ہے کس اُجڑے ہوئے گھر میں

انیس آخرت میں لب کشائی کرتے ہوئے:

ازل سے عشق حُسنِ بے نشاں کے روئے تاباں کا
لئے صد فتنۂ محشر ہوا مہمان دل و جان کا

ان سب قصیدوں سے محسنؔ کی قادرالکلامی اور آنحضرتؐ سے ان کی والہانہ محبت کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن ان کے کمال فن کا حقیقی مظاہرہ اور شہرہ فی الواقع ''مدیح خیر المرسلین''

کے سبب ہوا۔ محسن کا یہ نعتیہ قصیدہ اردو میں اپنی نوع کی بالکل نئی چیز ہے۔

امیر مینائی 1829ء کو لکھنو میں پیدا ہوئے اور 1900ء کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ امیر مینائی کی پیدائش جس گھر میں ہوئی تھی وہاں دینی ماحول دیکھنے کو ملتا تھا۔ انہوں نے چشتیہ صابریہ کے امیر شاہ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ ان کی طبعیت اور کلام میں تصوف، زہد، عشق، دین داری کا عکس نظر آرہا ہے شاید ان ہی پہلوؤں نے ان کو نعت گوئی کی طرف مائل کیا ہے۔

امیر مینائی نے شاعری میں بہت ساری اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ نعت گوئی کا لوہا انہوں نے ہر صنف مثلاً غزل، قصیدہ، رباعی، مثنوی وغیرہ میں آزمایا ہے۔ ان کی تصانیف میں ''محامد خاتم النبینؐ''، ''مثنوی نور تجلی و ابر کرم''، ''نعتیہ مسدّس صبح ازل''، ''شام ابد''، ''لیلۃ القدر'' اور ''انبیاؑ نعت'' سے متعلق ہیں۔

1857ء کے غدر کے بعد امیر مینائی نے نعت گوئی کو اچھے ڈھنگ سے اپنایا ہے۔ اس سے پہلے بھی ان کے کلام میں نعتیہ اشعار ملتے تھے لیکن غدر کے بعد مستقل طور پر نعت لکھنے کے عاشق ہوگئے۔ امیر مینائی نے رسمی طور پر نعت گوئی نہیں اپنائی بلکہ انہوں نے نعت گوئی کی طرف بطور خاص توجہ فرمائی اور اس کو مستقل صنف سخن کا آغاز عطا کیا ہے۔ اب ان کے نعتیہ کلام کے چند اشعار کی طرف متوجہ ہوں۔ ''محامد خاتم النبینؐ'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

مژدہ اے امت کہ ختم المرسلینؐ پیدا ہوا
انتخابِ صنعِ عالم آفرین پیدا ہوا
نور جس کا قبل خلقت تھا ہوا اس کا ظہور
رحمت آئی رحمت اللعالمین پیدا ہوا

زہے رحمت کہ ختم انبیاؑ کی آمد آمد
حبیب خاص محبوبِ خدا کی آمد آمد
زمانہ تیرہ و تاریک تھا اب روشنی ہوگئی
مٹی گی ظلمتیں شمع ہدا کی آمد آمد

اردو شاعری میں معراج کا ذکر کئی جگہوں پر ملتا ہے۔ ہر کسی نے معراج کے واقعے کو محبت کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی ہے۔ امیر مینائی نے بھی اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

گرم حضرتؐ کا یہ بازار تھا معراج کی شب
کہ خدا آپ خریدار تھا معراج کی شب

کس کے آنے کی فلک پر ہے خبر آج کی رات
آنکھ سورج سے ملاتا ہے قمر آج کی رات
اللہ نے خلوت میں بلایا شب معراج
کیا رتبۂ محبوب بڑھایا شب معراج

مولانا الطاف حسین حالی کا مشہور نعتیہ کلام پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس کلام کو آج بھی شہرت حاصل ہے اور لک بھگ ہر مسلمان ان اشعار کو دینی مجلسوں میں دھرایا کرتے ہیں۔ نعتیہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بھر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

اس کے بعد نعت گوئی میں اکبرالہ آبادی، اقبال، اور موجودہ دور کے شعراء نے بھی اپنا لوہا آزمایا۔ لیکن نعت گوئی میں جو شہرت محسن کاکوروی اور امیر مینائی کو حاصل ہوئی کسی اور کو نہیں ہوئی۔

زباں بریدہ (ناول)

ماہنامہ صدائے شبلی میں ہر ماہ ادارے کی طرف سے کتاب پر تبصرہ کیا جائے گا، اس لئے مصنفین، مولفین اور مرتبین سے گزارش ہے کہ وہ تبصرے کے لئے دوعدد کتابیں ضرور ارسال کریں۔ (ادارہ)

کتاب کا نام: زباں بریدہ (ناول)
مصنف : محمد آصف زہری
مبصر : ڈاکٹر ابرار احمد، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، عربی و فارسی، پونا کالج، پونے۔
پبلیشر : ایم۔آر۔ پبلی کیشنز، نئی دہلی

''زباں بریدہ'' ڈاکٹر محمد آصف زہری کا پہلا ناول ہے۔ نقش اول اتنا عمدہ و دلکش ہے، یقین نہیں ہوتا کہ مصنف کی یہ پہلی تخلیق ہے۔ نوع بنوع اسلوب اور تکنیک سے مرصع یہ ناول ایک کہنہ مشق فنکار کا عظیم شاہکار معلوم ہوتا ہے۔ ناول نگار نے اپنے احساسات، جذبات، تجربات، مشاہدات اور اپنے عہد کے مسائل وحوادث کو فکشن کی زبان میں بہت ہی خوبصورتی سے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ ساحر لدھیانوی کا یہ شعر ڈاکٹر محمد آصف زہری اور ان کے ناول کی بھرپور ترجمانی کرتا نظر آتا ہے۔

دنیا نے تجربات وحوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے، وہ لوٹا رہا ہوں میں

ناول نگار نے ''زباں بریدہ'' میں مشرقی اتر پردیش کے کسانوں کی سماجی، معاشی، معاشرتی اور تعلیمی مسائل کو اپنے انوکھے انداز میں کچھ اس طرح سے پیش کیا ہے کہ اعظم گڈھ کا دیہاتی معاشرہ اپنے تمام معائب ومحاسن کے ساتھ قاری کی نگاہوں کے سامنے چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ اور قاری خود کو اعظم گڈھ کے دیہات کی فضا میں پاتا ہے۔ وہی کھیت، کھلیان، بیل گاڑی، رہٹ، کچے راستے، باغ، باغیچے اور قدرتی مناظر جو دیہی زندگی کی آن شان بان ہیں، سے پورا ناول پر ہے، جن سے ہم اور آپ آشنا ہیں۔ اس ناول سے قاری کو لطف اندوز ہونے کے لیے مشرقی یوپی بالخصوص اعظم گڈھ کی دیہاتی زبان، رسم ورواج، چوپالی بولی اور کسانوں و دیہاتی عورتوں کے آپسی جھگڑے کے دوران زبان سے بے ساختہ نکلنے والی گالیوں سے واقفیت بیحد ضروری ہے۔ مصنف نے جان بوجھ کر ایسی گالیوں اور الفاظ کا استعمال کیا ہے تاکہ مہذب سماج کے فراڈ اور شرافا کے دوغلے پن کو طشت از بام کیا جاسکے، اگر حقیقت میں یہ الفاظ شرفا کی طبیعت کو مکدر اور سماعت پہ گراں گزر رہے ہیں تو ان کی بستی کے یہ انسان جو کیڑے مکوڑوں اور جانوروں سے بھی بدتر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں انھیں دیکھ کر ان کی شرافت اور انسانی غیرت وحمیت جوش کیوں نہیں مارتی کہ انسانیت کا تقاضا ہے، انھیں آدمی کے جون میں واپس لایا جائے، اور مہذب سماج کو ان کی حالت زار بے چین و بے قرار کیوں نہیں کرتی کہ یہ مہذب سماج کا انسانی واخلاقی فریضہ ہے کہ ان کی پسماندگی کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے ان گالیوں سے نہ تو ان کی طبیعت مکدر ہوتی ہے اور نہ ہی یہ ان کی سماعت پہ گراں گزرتی ہیں بلکہ وہ ان سے محظوظ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے موقعوں پر جہاں گالیوں کا تبادلہ ہوتا ہے، شرفا کی ایک بھیڑ جمع نظر آتی ہے جو گالیوں کے زیر و بم اور اس کی غنائیت سے لطف اندوز ہوتے ہیں، اور اگر کوئی بچہ خلل ڈالتا ہے تو اپنی شرافت کا رعب جھاڑتے ہوئے اس کو وہاں سے بھگا دیتے ہیں تاکہ پرسکون ماحول میں الفاظ کے اتار چڑھاؤ اور موسیقیت کا بھرپور لطف اٹھایا جاسکے۔ مصنف نے سماج کے اسی دوہرے پن اور شرفا کی ریاکاری ومکاری کو اپنی تلخ وبیباک حقیقت نگاری کے ذریعے پیش کرنے کی ایک عمدہ

کوشش کی ہے۔

موضوع کے لحاظ سے ''زباں بریدہ'' میں کوئی نیاپن نہیں ہے،لیکن ناول نگار نے ایک عام سے موضوع کو داستانوی تکنیک اور اسلوب کے دبیز پردے میں ملفوف کر کے اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ناول کی فکری وفنی سطح خاصی تہہ دار ہوگئی ہے۔ مصنف نے سمعی روایت سے استفادہ کرتے ہوئے عصر حاضر کے کسانوں، مزدوروں اور غریبوں کے مسائل ،سرمایہ دارانہ نظام،ہجومی تشدد،لو جہاد،گئو رکشا،فرقہ وارانہ فساد،نسلی ومذہبی تعصب،دہشت گردی،گودی میڈیا اور جنسی استحصال کو راجہ شرنگا مکٹ اور اچھیت پتاون کے تمثیلی وعلامتی پیکر میں ڈھال کر اس خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے کہ موضوع کی سنگینی مزید تہہ دار ہوگئی ہے،اور ناول میں اساطیری و دیومالائی جہت بھی پیدا ہوگئی ہے۔ ساتھ ہی ناول کا کینوس بہت وسیع ہوگیا ہے۔ذوالقرنین،یاج وماجوج اور سدسکندری کا دہقانی ورژن (Version) بھی گھسراون کی زبانی اودھی وبھوجپوری میں بہت ہی دلچسپ اسلوب میں قاری کے گوش گزار کیا ہے۔جس کے باعث ناول تحریری اور زبانی بیانیہ کا حسین سنگم بن جاتا ہے اور ناول کی یہی صفت اسے اپنے ماقبل کے ناولوں سے منفرد بناتی ہے۔

اس ناول میں ایک کمی جو مجھے نظر آئی وہ یہ ہے کہ ناول نگار اپنے کرداروں سے بہت زیادہ جذباتی لگاؤ رکھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے کرداروں کے بیچ میں خود بولنے لگتا ہے جس سے ناول کے فطری بہاؤ میں رکاوٹ سی محسوس ہوتی ہے، جو قاری کی سماعت کو بوجھل اور بیانیہ کے لطف کو زائل کر دیتی ہے۔مثال کے طور پر دھرموکسان کا ایک مکالمہ ملاحظہ ہو۔

''دھرمو نے ایک دوکش لیے۔ بیٹے کے چہرے پر نگاہ ڈالی اور سمجھانے کے انداز میں کہنا شروع کیا: میں بپت کو بچپن سے جانتا ہوں۔ہم دونوں ایک ساتھ بڑے ہوئے،ایک ساتھ شرارتیں کیں،ایک ہی اسکول میں پڑھے اور ایک ہی ساتھ فیل ہوئے پھر ایک ہی ساتھ اسکول چھوڑ دیا۔''صفحہ ۷۹ سے ۱۰۱ تک وہ اسی زبان میں اپنے بیٹے کو سمجھاتا ہے، پھر یکا یک وہ بھوجپوری میں باتیں کرنے لگتا ہے۔''اسی طرح گرمی کے دن میں میں نے دیکھا کہ ''اوکھلے ،ہتھوا میں ڈنڈالی ہے ہڈا کے دوڑائے کے مارت رہا۔مارت مارت مہوا پر بنے ہڈا کے چھتوا پر ایک ڈنڈا مرلس۔اوکے منہوا اور شریر وا پر تو ہڈا کا ٹلیکی اوکی چھتیو پر دو ٹھو ہڈا اچھن گئیلیں۔''اس کے بعد دھرمو پھر سے اردو بولنے لگتا ہے،طویل مکالمے کے درمیان کہیں کہیں وہ ایک دو جملے بھوجپوری کے بولتا نظر آتا ہے۔مکالموں کی یہی صورت کم وبیش پورے ناول میں نظر آتی ہے۔

ناول کا ہر کردار ''اچھیت پتاون'' کی بڑھتی تعداد اور ان کیظلم وجبر کے سامنے ایسا بے بس ولاچار محسوس کرتا ہے جیسے متعدی مرض ''کرونا وائرس'' کے سامنے حکومت اور اس کے کارندے بے بس نظر آتے ہیں۔راجہ شرنگا مکٹ کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل پیرا نہ ہونے کے سبب آج پوری دنیا کے انسان ''اچھیت پتاون'' کے ظلم وستم کو برداشت کرنے پر مجبور ہیں۔افسوس تو اس بات کا ہے کہ لوگ اس کے بچھائے ہوئے جال میں پھنستے جارہے ہیں اور ان کو احساس تک نہیں کہ وہ صیاد کے جال میں پھنس چکے ہیں۔اور اگر کوئی ان کی چالبازیوں سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی زبان تراش لی جاتی ہے۔نتیجتاً حاجی بپت ،دھرمو اور منیا زندگی کی جدوجہد میں بازی ہار جاتے ہیں،اور ''اچھیت پتاون'' بلاتفریق مذہب وملت ہر ایک کا استحصال کرتا رہتا ہے۔جس سے پورے ناول میں ایک ناامیدی اور مایوسیت کی فضا طاری ہوجاتی ہے۔

ناول نگار نے اپنے ناول میں فصیح وبلیغ الفاظ کے بجائے عوامی ودیہاتی مترادفات جن کی نوعیت عام طور پر معیوب اور مضحکہ خیز الفاظ کی ہوتی ہے،کا دل کھول کے استعمال کیا ہے۔مثلاً (کلّا ،جھاڑا،ڈیڑھوا،چلکی،گھڑا،مٹکا،لمڑا،بھور، سبیرا،بھنئی ،بردھوا،گھام،ٹکورا،گچھا،کھرکتوار،بوہارنا،نکھ رہری، ساٹا،کھپسا،پوہڑی،نرکٹ،گچ،مہرارو،پلنگا،نہارنا،کھلیاڑنا،گینڑا، کھینچڑنا، کھویا، پچھورنا،کھوٹیانا،بینا وغیرہ)۔اسی طرح دیہی

محاوروں، مثلوں اور کہاوتوں سے بھی خوب کام لیا ہے جس میں کوئی تصنع نہیں ہے۔ چند مثالیں: ''ستر چٹکی بہتر تال، پھر دیکھ کھینی کا کمال''، ''تین کیاری، تیرہ گوڑ، تب دیکھو گنے کی پوڑ''، ''گنے کی کھیتی، جیٹھ میں جرے، ماگھ میں ٹھرے، ایسی کھیتی لوڑے پہ چڑھے''، ''چیتوا کا چھپل، بیسکھوا کا پتاڑ۔ جیٹھوا میں بوہیا، کاؤ پہیا لانڑ''، ''اپنے مرو ہیا بنا، راب کی بھئی ربنی''، ''مردوں کے لیے مالا کمانا اور عورتوں کے لیے بیانا کمانا ایک جیسا ہے''، ''چریا میں چیر پھاڑ، اسریکھا میں سیوں چار، مگہا میں سڑائے گلائے اور پرڈا میں جن روپے رے بھیا، ایک دھان اٹھارہ پہیا''، ''لسڑ الگانا''، ''بن گروگیان ناہووے''۔ ہر چند کہ یہ معیاری اور ٹکسالی زبان نہیں ہے مگر عوام کا ذخیرہ الفاظ ان پر ہی مشتمل ہوتا ہے۔ زبان کی یہ شکل کتاب ولغت سے مختلف صوتی وسماعی ہے، کچھ الفاظ ایسے ہیں جن پر علاقائیت کا عنصر حد درجہ غالب ہے۔ مگر ان الفاظ کے استعمال سے وہ ایک تہذیبی فضا قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو ناول کے لیے پس منظر کا کام کرتی ہیں۔ ان الفاظ کو تحریری شکل دے کر ناول نگار نے اردو لفظیات میں ایک گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ ساتھ ہی الفاظ کو اس کے حسی حوالوں کے ساتھ محفوظ کرنے کی ایک مستحسن کوشش بھی کی ہے۔ ناول نگار نے چیتی کی طرح اگر کجری اور برہا کا بھی استعمال کیا ہوتا تو ناول کی تہذیبی منظر کشی مزید دوچند ہو جاتی۔ مجموعی طور ''زباں بریدہ'' ایک عمدہ ناول ہے، مجھے قوی امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر
UNANI CENTER FOR CARDIAC CARE

Consultation Time
Morning:11:00 am to 2:30 pm-Evening:7:00 pm to 9:30 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony
Tolichowki Hyderabad - 500008 T.S India

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم (اقامتی وغیر اقامتی ادارہ)

شاہی ہلز شاہین نگر حیدر آباد

زیر انتظام: شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدر آباد

Ac No: 1327104000065876 Bank Name: IDBI
Ac N: SHIBLI INTERNATIONAL ADUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST
IFS: IBkL0001327. Branch: Charminar Hyderabad (T.S)

بانی وناظم: مولانا ڈاکٹر مفتی محمد محامد ہلال اعظمی۔ موبائل: 9392533661